معارف

دسمبر ۲۰۱۸ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۲ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۱۸ء | عدد ۶

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

سنکیانگ جس کو اب زنگ جیان کہا جاتا ہے چین کا آخری شمال مغربی علاقہ ہے۔رقبہ کے اعتبار سے یہ چین کا سب سے بڑا انتظامی منطقہ ہے۔اس کا بڑا حصہ پہاڑوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے بعض علاقے بہت زرخیز ہیں اور پورا خطہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔شاہراہ ریشم پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ تجارت کا اہم مرکز رہا ہے۔کاشغر اور ختن اس کے اہم شہروں میں شامل ہیں۔ دارالسلطنت ارومچی ہے۔ پہلے اس خطہ ارض کو ایغورستان،مشرقی ترکستان اور چینی ترکستان کے نام سے جانا جاتا تھا۔اب اس کا نام زنگ جیانگ ایغور اٹانومس ریجن ہے۔اٹانومس اس علاقہ کو کہتے ہیں جس کو اندرونی خودمختاری حاصل ہو۔وہاں کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے خودمختاری کا دعوی ایک تہمت اور بھونڈا مذاق معلوم ہوتا ہے خاص طور سے اویغور مسلمانوں کے حوالہ سے جو وہاں کے اصل باشندے تھے۔ یہاں کئی اقلیتیں آباد تھیں،اصل آبادی ایغور مسلمانوں کی تھی۔ان کا تعلق ترک نسل سے ہے۔ان کی زبان اویغوری ترکی ہے۔مذہبی ہم آہنگی کے علاوہ یہ لوگ تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے بھی وسط ایشیا سے زیادہ قریب ہیں، ماضی قریب تک یہاں ان کی اکثریت تھی لیکن اب حکومت کی منصوبہ بند کوششوں کی وجہ سے یہاں ہان چینی جو چین کے اصل باشندے ہیں، بڑی تعداد میں آباد ہو چکے ہیں۔مختلف ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے اچھی ملازمتیں جو اب بڑی تعداد میں دستیاب ہیں وہ انہی چینی باشندوں کو ملتی ہیں،اس میں مقامی آبادی کا تناسب بہت کم ہے۔اس کی وجہ سے علاقہ میں جو خوش حالی آئی ہے بڑی حد تک مسلمان اس سے محروم ہیں۔

اویغور مسلمانوں اور چینیوں کے تعلقات میں کشیدگی کی ایک طویل تاریخ ہے۔یہ علاقہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے کم و بیش چین کے قبضہ میں ہے۔اگرچہ آزادی کا جذبہ ہمیشہ موجود رہا اور یہی دراصل اختلاف کا باعث رہا ہے۔سوویت یونین کے سقوط اور خطہ میں مسلم مملکتوں کے وجود میں آنے کے زیر اثر یہاں آزادی کے رجحانات میں اضافہ ہوا۔چینی حکام کی طرف سے امتیازی سلوک اور چینی آبادکاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ نیز اچھی ملازمتوں اور خطہ کے وسائل پر ان کے قبضہ نے ان جذبات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس لہر کو دبانے بلکہ کچلنے کے لیے جو ظالمانہ اور بے رحمانہ طریقہ اختیار کیا گیا اس سے حالات مزید خراب ہوئے۔واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سنکیانگ کے اویغور مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ عالم اسلام کو بھی ان کے حالات کا صحیح اندازہ نہیں۔ان کے لیے کہیں سے کوئی آواز نہیں بلند ہو رہی ہے۔اس وقت دنیا کا یہ سپر پاور ان کو جس طرح اپنے دین و ایمان اور تہذیب و ثقافت سے رشتہ کاٹنے پر مجبور کر رہا ہے اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔اقبال نے کہا تھا!

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

افسوس آج خود کاشغر کے مسلمانوں کی پاسبانی کرنے والا کوئی نہیں۔

اویغور مسلمانوں کے لیے اسلام ہی سب کچھ ہے، یہ عقیدہ بھی ہے، طرز حیات بھی، زندگی کا واحد حقیقی سہارا جو ان کی اجتماعی زندگی کی اساس بھی ہے اور وطنِ عزیز سے تعلق کی بنیاد بھی۔ چینی حکومت ان کو ہر قیمت پر اس متاعِ عزیز سے محروم کر دینا چاہتی ہے۔ دہشت پسندی کے خلاف جنگ کے نام پر آج کل پوری دنیا میں اسلام دشمنی کی جو چھوٹ ہر کس و ناکس کو ملی ہوئی ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کی موجودہ حکومت اویغور مسلمانوں کی زندگی سے دین و ایمان سے تعلق اور اس کے لیے غیرت مندی اور حمیت کے جذبات کو یکسر ختم کر دینا چاہتی ہے۔ اس کے لیے جو طریقے اختیار کیے جارہے ہیں ان کی وجہ سے یہ علاقہ ایک وسیع جیل میں تبدیل ہو گیا ہے جہاں نہ قانون کی حکمرانی ہے اور نہ دادرسی کا کوئی ذریعہ۔ آج سنکیانگ میں مسلمان ہونا اور مسلمان کی حیثیت سے باقی رہنے کی خواہش رکھنا ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ان کو اپنے دین اور ثقافت کے، جن کی جڑیں دراصل مذہب ہی میں پیوست ہیں، آزادی نہیں۔ مذہب کی عمومی پیروی کی بھی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ نماز کی پابندی، قرآن پڑھنا، ریش کی درازی، بیرون ملک روابط یا سفر کسی بھی شخص کی گرفتاری کے جواز کے لیے کافی ہیں۔ جو گرفتار ہو جائے اس کے مصائب اور آلام کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے اور جو ابھی گرفتار نہیں ہوئے ہیں وہ اسی اندیشہ اور خوف کے سائے میں زندگی گذارتے ہیں۔ خطہ کے تمام مدارس جن کی تعداد ۹۰۰ سے زیادہ تھی بند ہو چکے ہیں۔ مسجدوں پر سخت نگرانی رکھی جاتی ہے۔ جو ایک بار گرفتار ہو گیا وہ کبھی رہا بھی ہوگا یا نہیں اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ رہائی پانے والوں کی شخصیت تباہ ہو چکی ہوتی ہے۔ چینی حکومت اسلام کو ایک ذہنی بیماری سمجھتی ہے اور اس کا علاج ضروری سمجھتی ہے۔ اس علاج کے لیے وہ جو طریقے اختیار کرتی ہے اس نے ایغور مسلمانوں کے پورے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اس نئے معاشرہ میں جس کو چینی حکومت تشکیل دینا چاہتی ہے نہ تو عقیدہ کے لیے کوئی جگہ ہے نہ خاندانی امن و سکون۔ ان بدنصیب شہریوں کے اوپر نظر رکھنے کے لیے حکومت نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے گھر کی چہار دیواری کا تقدس بھی مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص کو اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر بھی ویسی ہی محتاط زندگی گذارنی پڑے گی جیسی گھر کے باہر۔ چینی حکومت نے صوبہ کے دس لاکھ چینی ملازمین کو یہ حکم دے دیا ہے کہ وہ ایغور مسلمانوں کے گھروں میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے مسلط ہو جائیں اور ان کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔

ابھی اگست میں اقوام متحدہ نے قابل اعتبار شواہد کی بنیاد پر اویغور مسلمانوں کے تعلق سے ایک رپورٹ جاری کی ہے۔ اس کے مطابق سنکیانگ میں ایک ملین سے زیادہ لوگ حراستی کیمپوں میں محبوس ہیں۔ یہ تعداد دو ملین تک ہو سکتی ہے۔ علاقہ میں ایغور مسلمانوں کی آبادی گیارہ ملین بتائی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آبادی کا کتنا بڑا حصہ مقید ہے۔ مزید یہ کہ اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حراستی کیمپوں کو چینی حکومت ری ایجوکیشن سنٹر یا ووکیشنل ایجوکیشن اینڈ ایمپلائمنٹ ٹریننگ کا نام دیتی ہے۔ ان کیمپوں میں محبوس لوگوں کی زندگی حد درجہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے، مسلسل تعلیم اور ٹریننگ کے ذریعہ کمیونسٹ نظریات کو ان کے دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اسلام سے دوری اور بیزاری کا اظہار و اعلان کریں، مذہبی عقائد پر تنقید

کریں اور کمیونزم کے گن گائیں۔ ان کو شراب پینے اور سور کا گوشت کھانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک غیور مسلمان کے بجائے ایک ملحد اور چینی حکومت کے وفادار شہری کا قالب اختیار کر لیں۔ اس طرح وہ ایک نیا جنم لے لیں اور ایک نئی جون اختیار کر لیں۔ اسلامی تشخص سے محروم کرنے کے لیے ان پر جو جبر کیا جاتا ہے اس کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں۔

نئی ایغور نسل کو اسلام سے دور رکھنے اور ان کو وفادار چینی شہری کی حیثیت سے پروان چڑھانے کے لیے حکومت نے ایسے طریقے اختیار کیے ہیں کہ ایغور بچے اپنی جڑ سے، اپنے ماضی سے اور اپنی تاریخ، اپنے گھر اور خاندان سے وابستہ یادوں سے اس طرح کٹ جائیں کہ ان کے اندر اپنے مذہب، تہذیب اور قوم سے کسی طرح کی وابستگی کا کوئی احساس باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے یتیم خانے قائم کیے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ان بچوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں جن کا تعلق کمزور طبقات سے ہے تاکہ مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان کے لیے ایک روشن مستقبل کو یقینی بنایا جا سکے۔ ان یتیم خانوں میں جبراً ان بچوں کو بھی داخل کر دیا جاتا ہے جن کے والدین موجود ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ یتیم خانہ میں داخل ہو جانے کے بعد ان بچوں سے رابطہ کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب تک ایسے ۴۵ یتیم خانوں کا پتہ چل سکا ہے۔ ان کو چلڈرن ویلفیر سنٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان مراکز میں اس بات کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے کہ یہ بچے اس طرح پروان چڑھیں کہ ان کو نہ تو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد رہے اور نہ اپنے مذہب، ثقافت اور گھر، خاندان کے بارے میں۔ ماضی سے وابستہ ہر تعلق کو ذہن و دماغ سے کھرچ کر پھینک دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کو سب سے پہلے اپنی اس زبان سے محروم کر دیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی ماؤں کی آغوش میں سیکھی تھی اور جو اپنے ماحول، خاندان اور دین و ثقافت سے وابستگی کا سب سے اہم ذریعہ اور واسطہ ہے۔ ان کو اپنی مادری زبان ایغوری بولنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ ان کو منڈرین (Manddrin) بولنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو چینی بولتے ہیں۔ ان کو چینیوں کے طور طریقے اور آداب سکھائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بھی نسلی تطہیر کی ایک صورت۔ جب وہ وہاں سے بڑے ہو کر نکلیں گے تو نہ تو وہ اپنے والدین اور اہل خانہ کو پہچان سکیں گے اور نہ ان کے اندر اپنے دین و مذہب سے وابستگی کی کوئی رمق باقی رہے گی۔ وہ ایغور سے زیادہ چینی ہوں گے۔ ایغور قوم کے لیے ان کی حیثیت ایک گمشدہ نسل کی ہوگی۔

سنکیانگ میں ایغور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس کی محض ایک جھلک ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایغور جن حالات میں زندگی گذار رہے ہیں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس پوری صورت حال کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ پوری دنیا اس پر خاموش ہے۔ چین سے سب کے سیاسی یا معاشی مفادات وابستہ ہیں، کسی کو معاشی امداد چاہیے، کوئی سیاسی تعاون کا خواستگار ہے، کوئی بلٹ اینڈ روڈ انی شی ایٹو کے سحر میں گرفتار ہے، کوئی ان کے سہارے ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کی ایک بڑی تعداد کو پتہ ہی نہیں کہ سنکیانگ میں ان کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

مقالات

علامہ شبلی اور نواب محسن الملک

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

جانشین سرسید نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں (۱۸۳۷ـ۱۹۰۷ء) قوم کے ان محسنوں میں ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں قوم کو پستی اور زبوں حالی سے نکالنے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ وہ تحریک علی گڑھ کے کاروان اول کے رکن اعظم اور سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ـ۱۸۹۸ء) کے دست و بازو تھے۔ ان کا ہر طرح سے تعاون کیا اور ان کے بیشتر کاموں میں عملاً شریک رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی وفات (۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) کے چند ماہ بعد انہیں ایم اے او کالج علی گڑھ کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اسے بخوبی نبھایا اور کالج کو بڑی ترقی دی۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا؟ لیکن خدا نے ان ہی کے ہم نشینوں میں سے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہم سر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی، وسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا۔ اس نے تھوڑی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا، کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جا کر دیکھے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہوگا۔ کانفرنس جو روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی تھی، نواب محسن الملک مرحوم نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیے''۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۱۹۳)

نواب محسن الملک بڑے عالم فاضل شخص تھے، ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی، یہی وجہ

رفیق اعزازی دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ Email: azmi408@gmail.com (Mob: 919838573645)

ہے کہ اسلامی علوم پر ان کی گہری نظر تھی، وہ اچھے اہل قلم اور مصنف تھے، ان کا شمار تہذیب الاخلاق کے دور اول کے بڑے مضمون نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے کئی کتابیں اور رسالے نکلے اور مقبول ہوئے، جن کے نام یہ ہیں:

آیات بینات (چار حصے، مطبوعہ ۱۸۷۰۔۱۸۷۶ء) کتاب المحبت والشوق، مولود شریف مطبوعہ ۱۸۶۰ء، تقلید اور عمل بالحدیث، اشاعت اسلام مطبوعہ ۱۸۹۲ء امرتسر، فطرت اور قانون فطرت غیر مورخہ، مکاتبات الخلان، مضامین تہذیب الاخلاق وغیرہ۔

وہ اپنے عہد کے بہت مشہور خطیب تھے اور نہایت عالمانہ تقریریں کرتے تھے، ان کے بعض خطبات کتابی صورت میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ ان کے ۸۴/خطبات کا ایک مجموعہ مولوی امام الدین گجراتی نے ان کی زندگی ہی میں مرتب کیا تھا جسے ۱۹۰۴ء میں ملک فضل الدین تاجر کتب قومی کتب خانہ لاہور نے شائع کیا۔

ان کے خطبات اہم قومی وملی مسائل پر ہیں، ان میں اشاعت اسلام کو خاص طور سے بڑی مقبولیت ملی، ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں تعلیمی وملی معاملات اور جدید تعلیم کی حمایت میں انہوں نے جو خطبات دیے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر وہ جس پایہ کے شخص تھے ان کے شایان شان انہیں خراج عقیدت نہیں پیش کیا گیا، منشی امین زبیری (۱۸۷۰۔۱۹۵۸ء) کی ''حیات محسن'' مطبوعہ ۱۹۳۴ء ان کے تمام کارناموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرزندوں پر یہ قرض بہرحال باقی ہے۔

نواب محسن الملک سرسید کے بعد علی گڑھ تحریک کی دوسری بڑی شخصیت تھے جن سے علامہ شبلی کے گہرے روابط اور محبت آمیز تعلقات اخیر تک قائم رہے۔ سرسید اور شبلی کے باہمی تعلقات، افادہ واستفادہ اور اختلاف فکر ونظر پر متعدد مضامین ومقالات لکھے گئے ہیں، متعدد کتابوں میں بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ فاروق دیوانے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے مگر نواب محسن الملک اور علامہ شبلی کے باہمی تعلقات پر غالباً اب تک ایک بھی مقالہ نہیں لکھا گیا۔ یہی کمی اس تحریر کا باعث ہے۔

علامہ شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر فارسی وعربی وابستہ ہوئے اور ۱۶/سال تک وابستہ رہے، نواب محسن الملک علی گڑھ تحریک اور سرسید سے اس سے بہت پہلے

غالباً ۱۸۶۲ء سے وابستہ تھے لیکن ان دونوں کے درمیان پہلی ملاقات کب ہوئی اور کب روابط قائم ہوئے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ علامہ شبلی کے قلم سے ان کا پہلا ذکر مثنوی صبح امید میں ملتا ہے۔ جو علی گڑھ تحریک کی حمایت میں ۱۸۸۵ء میں علامہ شبلی نے لکھی تھی، اس میں سرسید کا جیسا سراپا کھینچا گیا ہے ویسا شاید ہی آج تک کسی اور شاعر نے کھینچا ہو، اس میں نواب محسن الملک کا ذکر اس طرح ہے:

وہ نکتہ ور حقیقت آگاہ
یعنی مہدی علی ذی جاہ

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس الہ آباد میں دونوں شریک تھے۔ اسی طرح ۱۸۹۲ء میں کالج کا جوڈیپوٹیشن سرسید کی سربراہی میں حیدرآباد گیا تھا، اس میں علامہ شبلی بھی شریک تھے۔ نواب صاحب اس وقت حیدرآباد میں ایک بڑے عہدہ دار تھے، ان مواقع پر یقیناً دونوں میں ملاقاتیں رہی ہوں گی۔

اس کے تین سال بعد ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا، چنانچہ مبارک باد اور تہنیت کے لیے کالج میں جلسہ منعقد ہوا جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اشخاص سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس کرامت حسین وغیرہ نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی صدارت نواب محسن الملک نے کی تھی، ان کی صدارتی تقریر اور جلسہ کی کارروائی انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔ ۱۹۵۳ء) نے اسے حیات شبلی میں نقل کیا ہے۔ محسن الملک کی صدارتی تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف واقف تھے بلکہ دونوں میں گہرے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے۔ یہ خطبہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے بارے میں کالج کے سب سے بڑے محسن کے کیا خیالات تھے۔ نواب محسن الملک نے اپنی صدارتی تقریر کے آغاز میں کہا کہ:

> ”صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب سے شاگردی کا فخر حاصل ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، میں اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں.....

عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف وتالیف اور تقریر وتحریر سے بڑے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں، کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو۔ اس لیے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارک باد دیتا ہوں''۔ (حیات شبلی، ص ۲۶۹۔۲۷۰)

بعدازاں نواب صاحب نے علامہ شبلی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر حکومت کو، کالج کو اور پھر قوم کو مبارک باد دی، ان کا خیال تھا کہ:

''مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے، وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے''۔ (حیات شبلی ص ۲۷۰)

علامہ شبلی کی ذاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کے ان صفات کا اندازہ کرسکتے ہیں جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھر دیے ہیں''۔ (حیات شبلی ص ۲۷۰۔۲۷۱)

پھر نواب صاحب نے علامہ شبلی کے علم وفضل، ان کی تصنیفات وتالیفات کی عظمت، علوئے مقام ومرتبہ اور ان کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا اور کہا کہ:

''جن کو ان کی تالیفات وتصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے

بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پرزور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔ اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان دو تین مصنّفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصد بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈال دی۔ فللہ درہ و علی اللہ اجرہ۔ (حیات شبلی ص ۲۷۱)

علامہ شبلی نے اپنی تصنیفات مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان کے علاوہ علی گڑھ میں محققانہ تاریخی مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے تحت انہوں نے الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین وغیرہ مقالات لکھے تھے۔ اس سلسلہ نے بے حد مقبولیت پائی، سرسید بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے۔ چنانچہ انہوں نے تصحیح اغلاط تاریخی کا ایک صیغہ قائم کرکے علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا اور ان کے تاریخی مقالات اس میں شامل کیے۔ (حیات شبلی، ص ۲۰۶) نواب محسن الملک بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے اور انہیں خدائے ذوالجلال کی رضامندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

”صاحبو! ہمارے دوست مولانا شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں

پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ ان چند اعتراضوں کا دور کرنا جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کردیا تھا، اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرستہ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا، حکیمانہ زندگی بسر کررہا تھا ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کردیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی۔ حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے"۔ (حیات شبلی ص ۲۷۱-۲۷۲)

علامہ شبلی کی مذکورہ علمی تحقیقات کو نواب صاحب ان کی فضیلت اور شمس العلما ہونے کے لیے کافی قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لیے کافی اور ان کے شمس العلما ہونے کے شاہد تھے"۔ (حیات شبلی ص ۲۷۲)

نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کو طلبائے علی گڑھ کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ قرار دیا اور ان کی درازیِ عمر کی دعا کے ساتھ طلبہ کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا مشورہ دیا:

"اے میرے عزیز! اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہونچتی ہے۔ تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جب کہ تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو۔ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو۔ تمہارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمہارے دلوں کو منور کرنے کے لیے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے جانے نہ دو اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو تا کہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سیکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے اور اس کا سایہ ہم پر پڑے"۔ (حیات شبلی، ص ۲۷۳)

علامہ شبلی کو خیال پیدا ہوا کہ ایم اے او کالج کی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرنا چاہیے مگر اس کے لیے حالات سازگار نہیں تھے۔ ۱۸۹۶ء میں مولوی سید علی بلگرامی جن سے علامہ شبلی کے گہرے مراسم تھے، کے ذریعہ وہ حیدرآباد پہنچے اور انہیں کی کوششوں سے حکومت آصفیہ نے ۱۰۰ر روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا تا کہ وہ اپنا تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کر سکیں۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں کالج میں یہ قیاس آرائی ہونے لگی کہ علامہ شبلی کالج سے کنارہ کش ہونے والے ہیں، چنانچہ صحیح صورت حال سمجھنے کے لیے نواب محسن الملک نے انہیں خط لکھا، وہ خط تو دستیاب نہیں البتہ علامہ شبلی نے ان کا جو جواب لکھا وہ مکاتیب شبلی حصہ اول میں شامل ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"جناب من! آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی، آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں، اسکول کے لیے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا، لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے باہر نہیں جاتا، مجھ کو سردست ۵۰۰ر ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے خرچ بڑھ جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر

رہوں تو پس انداز ہوسکتا ہے۔ باقی وہاں کے لیے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت ہے۔

مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہش سے جکڑا ہوا ہے لیکن دنیا کو سلیقہ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ سازش، درباداری، خوشامد لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم، اس لیے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا۔

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی، چنانچہ اسی قدر ماہوار کا منصب مقرر ہوگیا۔ الفاروق کے بعد ۱۵۰/ یا ۲۰۰/ روپے ہوجائے، روبکار میں بھی اضافہ کا وعدہ درج کردیا گیا ہے گو مقدار کی تعین نہیں، بس میری تنہا زندگی کو یہ بہت ہے، تاہل کا ارادہ نہیں، زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے اور یوں تو ع کاسہ چشم حریصاں الخ..... رہا قوم کی خدمت کرنی اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کرکے دو چار کو نوکری دلاؤ، بجائے اس کے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں''۔ (مکاتیب شبلی، ج۱، ص ۱۷)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت علی گڑھ کالج میں محض یہی مشتہر نہیں تھا کہ علامہ کالج سے علاحدہ ہورہے ہیں، بلکہ یہ بھی مشہور تھا کہ علامہ شبلی اپنے قائم کردہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے لیے حیدرآباد میں چندہ بھی کررہے ہیں۔ اس خط سے یہ بھی واضح ہورہا ہے کہ علامہ شبلی اور نواب صاحب کے درمیان بڑی بے تکلفی بھی تھی وہ اپنے بارے میں انتہائی صفائی سے لکھ رہے ہیں کہ وہ کوئی ابراہیم ادہم اور بایزید بسطامی نہیں اور یہ بھی کہ ابھی تاہل کا ارادہ بھی نہیں اور جس قدر حیدرآباد سے منصب مقرر ہوا ہے وہ ان کے مصارف کے لیے کافی ہے اور آخری جملے میں وہ کالج پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

بہر حال علامہ شبلی اس وقت کالج سے علاحدہ نہ ہوئے اور سرسید کی حیات تک کالج سے وابستہ رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کالج سے علاحدہ ہونے کا ارادہ انہوں نے ترک کردیا تھا بلکہ انہوں نے

جب کالج سے علاحدہ کی بات کی تو مسٹر بیک پرنسپل نے سرسید سے کہا کہ علامہ شبلی ایک قابل مصنف ہیں ان کا کالج سے وابستہ رہنا مفید ہوگا۔ آپ انہیں سمجھائیے کہ جس طرح یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں پروفیسر چھ ماہ تعلیم و تدریس کا کام کرتے ہیں اور بقیہ چھ ماہ وہ رخصت پر ہوتے ہیں اور ان کے نائبین تدریس کا کام انجام دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی چھ ماہ تدریس کا کام کریں اور بقیہ چھ ماہ تصنیف و تالیف میں منہمک رہیں۔ گرچہ سید محمود نے اس تجویز کی مخالفت کی مگر سرسید نے مسٹر بیک کی یہ بات تسلیم کرلی۔ (آپ بیتی، میر ولایت حسین، ص ۱۱۶)

یہ زمانہ (۹۸۔۱۸۹۷ء) علی گڑھ کالج کی تاریخ میں خلفشار کا زمانہ تھا، خاص طور پر سرسید اور سید محمود کی بے لطفی سے کالج کی فضا بھی بے لطف تھی، آخر کار سرسید گھر چھوڑ کر نواب اسماعیل دتاولی کے گھر چلے گئے اور پھر اسی مکان سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ علامہ شبلی بھی سرسید کی عنایت کردہ بنگلیہ چھوڑ کر نواب اسماعیل دتاولی کے مکان میں چلے گئے تھے (ایضاً ص ۱۲۵) اور سرسید کی وفات کے دو ماہ بعد استعفیٰ دے کر اعظم گڑھ کی راہ لی۔

سرسید، سید محمود کو اپنا جانشین بنا گئے تھے چونکہ سید محمود کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی اور مسٹر بیک پرنسپل کو لندن سے وہی لے کر آئے تھے اس لیے کالج کا انگریزی اسٹاف ان کا ہم نوا تھا اور ان کی طرف داری میں سرسید سے اخیر دور میں دباؤ ڈال ڈال کر فیصلے کرواتا تھا جس کی وجہ سے ٹرسٹیز ناراض ہو گئے، جس میں نواب محسن الملک، وقار الملک اور مولانا حالی جیسے کالج کے ہمدرد و بہی خواہ بھی شامل تھے، چنانچہ ٹرسٹیز نے سرسید کے خلاف ایک تحریر تیار کی جو پریس کے لیے دے دی گئی تھی کہ سرسید نے وفات پائی، اس حادثہ کی وجہ سے وہ تحریر واپس لے لی گئی مگر دلوں میں جو کھائی پیدا ہوگئی تھی وہ باقی رہی، سید محمود کے رویے نے اس میں اور اضافہ کیا، یہاں تک کہ کالج کا انگریزی اسٹاف بھی ان کے خلاف ہوگیا اور جنوری ۱۸۹۹ء میں سید محمود کی جگہ نواب محسن الملک کو سکریٹری منتخب کیا گیا، سید محمود اگرچہ سخت بپھرے مگر نواب صاحب نے انہیں رام کرلیا اور سخت جد و جہد کے بعد کالج کو انتشار سے بچا کر ترقی کی راہ پر لگا دیا، اس وقت علامہ شبلی مستعفی ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم اور علیل تھے، چنانچہ نواب محسن الملک نے اپنے دوست کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ سکریٹری شپ ملنے کے بعد غالباً یہ ان کا پہلا سفر تھا، وہ مارچ ۱۸۹۹ء میں اعظم گڑھ آئے اور تین دن شبلی منزل میں مقیم

رہے، علامہ شبلی نے اپنے بھائی مولوی اسحاق ایڈوکیٹ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے، ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا لیکن میں اس کی برداشت کرسکا''۔ (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴۱)

اس خط پر تاریخ کے بجائے محض سنہ ۱۸۹۸ء درج ہے، علامہ شبلی خطوط پر مکمل تاریخ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے مگر کبھی کبھی بلا تاریخ بھی خط لکھ دیتے تھے، جیسا کہ مکاتیب شبلی کے دونوں حصوں میں بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے، مذکورہ خط پر ۱۸۹۸ء درج ہونے کی وجہ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد کا ذکر اسی سنہ کے ذیل میں کیا ہے۔ (حیات شبلی ص ۳۴۹)

۲۰۰۷ء میں پروفیسر اقبال حسین نے ''دستاویزات محسن الملک'' مرتب کرکے شائع کی ہے، اس میں دستاویز (نمبر ۱۷، اور شمار نمبر ۱۶۷) ''خط طلبائے اعظم گڑھ'' کا بھی اندراج ہے، فہرست سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایم اے او کالج میں مقیم طلبائے اعظم گڑھ کا کوئی خط ہے جو انہوں نے نواب صاحب کے نام لکھا ہے مگر دراصل یہ طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا وہ سپاس نامہ ہے جو انہوں نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد پر پیش کیا تھا، اس پر جو تاریخ درج ہے وہ ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نواب صاحب سکریٹری منتخب ہونے کے بعد مارچ ۱۸۹۹ء میں اعظم گڑھ آئے تھے نہ کہ ۱۸۹۸ء میں۔ چوں کہ علامہ شبلی کے مذکورہ بالا خط میں محسن الملک کے قیام اعظم گڑھ کی مدت تین دن لکھی ہے اس لیے اس کی تاریخ کی تعیین ۲۱/ ۲۲/ مارچ سے ۲۴/ ۲۵/ مارچ ۱۸۹۹ء کی جاسکتی ہے۔

اس سپاس نامہ کو اصل سے نقل کرنے میں مرتب نے احتیاط نہیں کی ہے، کمپوزنگ کی متعدد غلطیاں بالکل واضح ہیں حتی کہ تاریخ کے اندراج میں بھی کئی غلطیاں ہیں، چار صفحے کے اس سپاس نامہ کے پہلے صفحہ پر ۲۳/ اپریل ۱۸۹۸ء کی تاریخ درج ہے اور بقیہ صفحات میں ۲۳/ اپریل ۱۸۹۹ء۔ سپاس نامہ کے اختتام پر ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا یہ سپاس نامہ یقینی ہے کہ علامہ شبلی کی ایما ہی سے پیش کیا گیا ہوگا۔ مشمولات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے بہر حال یہ سپاس نامہ اپنے مشمولات کے لحاظ

سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''معلیٰ القاب جناب نواب محسن الملک صاحب!

ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ جو عالی جناب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب کی ایک ادنیٰ شعاع فیض وضیاء مکرمت ہے اور جس کی تمام رفعت و ترقی مولانا ممدوح کی ہمدردی و روشن ضمیری کے خیالات سے وابستہ ہے، نہایت ادب سے دلی جوش کی شادمانی واٹھتے ہوئے جوش دل کے دلوں کے مسرت سے اس مبارک اور قابل فخر موقع پر جب کہ حضور عالی کے کوکب ہمایوں کے ورود نے اس سرزمین کو فلک چہارم کی عزت دی یا یوں کہیے کہ جناب شمس کی عیادت کی تقریب سے خورشید درخشاں نے قدم رنجہ فرمایا کہ اس سے ہمارے مرزبوم کے ہر خار وخس کو رتبہ انا الشرق عطا کیا ہے۔ چند سطور حضور عالی کے قومی خدمات کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں''۔(دستاویزات محسن الملک،ص ۷۴۳)

بعدازاں ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کیا گیا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بے بسی بیان کی گئی ہے اور یہ خوف ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانان ہند اسپین کے مسلمانوں کی طرح کے حالات کے قریب پہنچ گئے تھے۔ایسے میں رحمت حق نے دوسیدوں کو پیدا کیا، پھر پہلے سید سرسید احمد خاں کی کاوشوں کا ذکر ہے بعدازاں دوسرے سید نواب محسن الملک کی شخصیت کا۔اس میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد خوف تھا کہ تحریک علی گڑھ کہیں پژمردہ نہ ہوجائے مگر محسن الملک کی ذات گرامی سے یہ خوف جاتا رہا۔اصل عبارت یہ ہے:

''خلد آشیاں سید مرحوم کی وفات بے وقت وناگہانی سے ہم بچگان اسلام کو اسلامی اوج وشان کی ترقی کی طرف سے ایک قسم کی مایوسی ہوگئی تھی، آپ کے قابل تعظیم قوت بازو کی ٹوٹنے سے ہم سخت متوحش تھے کہ مبادا ترقی کے ذرائع رک جائیں اور وہ قابل فخر مدرسہ سرچشمہ علم ومعدن فنون محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ جو غفرلہ سرسید مرحوم کی کوششوں کا ثمرہ ہے، اس کی روانی وطراوت اور اس کے ارکان و وصول تعلیم میں کوئی ناخوش گواری وڈھیل واقع ہو اور اسلامی جماعت کا کوئی حامی ومعین

نہ رہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ ہماری مایوسی خوشی سے بدل گئی اور یہ بات اب علانیہ نظر آرہی ہے کہ قابل تعظیم مرنے والا اپنے مرتے وقت ودیعۃً اپنے تمام دست و بازو کی قوت، اپنی تمام دلی روشنیاں و روشن ضمیریاں، اپنے تمام متبرک اوصاف و برکات کو حضرت مہدی کے تمام برگزیدہ شمائل، زور آور دست و بازو، مستقل جد و جہد، نورانی دل مصفا اور روشن دماغ پر اضافہ کرتا گیا ہے، جس کے قابل عظمت و سرگرم کوشش سے یہ صریح آشکارا ہے کہ سید مرحوم کی کوششوں سے جو پود لگی تھی وہ جلد تناور درخت ہوگی اور اس کے ثمر سے انشاء اللہ ایک عالم بہرہ مند و فیض یاب ہوگا اور اس درس گاہ سے جو آپ کے صدقہ محنت میں جو یونیورسٹی بننے والی ہے وہ چشمہ فیض جاری ہوگا کہ مسلمانان ہند کے علمی خزاں خوردہ باغ میں ہمیشگی کی بہار آوے گی''۔ (دستاویزات محسن الملک، ص ۳۴۸۔۳۴۹)

اس سپاس نامہ کا آخری پیراگراف نواب صاحب کے لیے دعا اور نیک خواہشات کے ساتھ طلبائے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے علی گڑھ سے والہانہ تعلق کا مظہر ہے:

''ہم کو آپ کی ہر تمام کوشش و مدرسۃ العلوم کے ساتھ نسبتاً دلی ہمدردی ہے، اس طرح پر کہ گویا مدرسۃ العلوم میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں اور حضور عالی جناب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کو بھی حضور مدرسۃ العلوم کا طالب علم تصور فرمائیں۔ اب ہماری یہ دعا ہے، حضرات! آپ آمین کہیے کہ اے خدا، اپنے رسول پاک و نبی اکرمؐ کے طفیل میں ہمارے محسن، ہمارے حامی، ہمارے رہنما، ہمارے ناخدا جناب نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب بہادر کو جو ہمارے اعتقاد و یقین سے ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے رہبر ہیں، خضر کی عمر اور نوح کی حیات عطا کر، وائے خدا، اے خدا ہمارے محسن الملک کی اس تکلیف راہ اور صعوبت سفر کا خیال کر کے اپنے فضل و جلال کے صدقہ میں ان کی کوششوں کو کامران اور ان کے دلی ارادوں کو کامیاب کر، آمین ثم آمین''۔ (ایضاً ص ۳۵۰)

یہ سپاس نامہ پیش کرنے کے لیے یقیناً کوئی تقریب نیشنل ہائی اسکول یا شبلی منزل میں منعقد ہوئی ہوگی مگر اس کی تفصیل دستیاب نہ ہوسکی، البتہ اس کے متن کے ایک جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ تقریب منعقد ہوئی تھی، ممکن ہے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس کی کوئی تفصیل درج ہو۔

یہ سپاس نامہ نواب صاحب کو جس وقت پیش کیا گیا علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے علاحدہ ہوکر اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری منتخب ہوچکے تھے، ممکن ہے علامہ شبلی نے اسے نہ دیکھا ہو مگر اس کے لکھنے میں ان کا مشورہ ضرور شامل رہا ہوگا کیونکہ اس وقت تک علامہ شبلی کا جو تعلیمی نظریہ قائم ہوچکا تھا اس کی بازگشت اس کے صفحات میں صاف سنائی دیتی ہے، مثلاً یہ اقتباس کہ:

> "اور خدا کی مہربانیوں سے کچھ بعید نہیں ہے کہ علی گڑھ کے سرچشمہ علوم سے لارڈ بیکن کے ساتھ حضرت امام غزالی کی روح بھی خروج کرے۔ اڈلین و میکالے کے ساتھ امام رازی و امام بخاری کی برکتیں بھی اپنا جلوہ دکھائیں"۔ (دستاویزات محسن الملک ص ۳۴۹)

علامہ شبلی کے علی گڑھ کالج چھوڑنے اور حیدرآباد کا رخ کرنے کے بعد اہل قلم نے کئی اسباب بیان کیے ہیں، اس کی تفصیل سے قطع نظر دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ میں نے علی گڑھ ندوہ کے لیے چھوڑا گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے حیدرآباد جانا پڑا، جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سرسید سے ان کی کشمکش اور اختلافات کو اس کا سبب قرار دیا ہے علاوہ ازیں حیدرآباد رخ کرنے کا ایک سبب والد کے ذریعہ چھوڑا گیا قرض بھی بتایا ہے۔ لیکن اصل سبب علامہ شبلی سے انگریزوں کی بدگمانی تھی، سید صاحب نے حیات شبلی میں انگریزوں کی بدگمانی اور اس کے اسباب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ نواب محسن الملک جو اس زمانہ میں شبلی کے سب سے بڑے بہی خواہ نظر آتے ہیں، انہوں نے بھی شبلی کو حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا، (حیات شبلی ص ۳۶۶) اس کی وجہ شاید انگریزوں کی بدگمانی ہی رہی ہوگی، کیوں کہ اس زمانہ میں انگریز علامہ شبلی کے خلاف تھے اور انہیں اتحاد اسلامی کا علم بردار خیال کرتے تھے۔ ندوہ سے بھی بدظن تھے۔ بہرحال شبلی کے حیدرآباد بعجلت جانے میں محسن الملک کا مشورہ بھی شامل تھا۔ (حیات شبلی ص ۳۶۶)

۱۹۰۰ء علامہ شبلی کے لیے بڑی کشمکش کا سال تھا، ابھی انہوں نے علی گڑھ سے قطع تعلق کے

بعد مستقبل کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ان کے والد شیخ حبیب اللہ نے ۱۲/ اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا، اس کے ساتھ ہی تقسیم وراثت کے مسائل کھڑے ہوگئے۔ اسی زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا رام پور میں اجلاس ہونا طے پایا تو نواب محسن الملک نے شرکت کی خواہش کی تاہم وہ تقسیم وراثت کے مسائل کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴۶) اسی سال نواب محسن الملک نے انہیں دینیات کمیٹی کا رکن نامزد کیا اور ان کو شرکت کی دعوت دی، اس کے جواب میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

"عالی خدمت جناب محسن الملک بہادر سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ

بہ جواب والا نامہ مورخہ ۳۱/ مارچ ۱۹۰۰ء

میں فخر کے ساتھ دینیات کے صیغہ کی ممبری منظور کرتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج ۲/ اپریل کو خط پہنچا ہے، تیسری تک کس ذریعہ سے علی گڑھ پہنچ سکتا ہوں۔

والسلام

شبلی نعمانی

۲/ اپریل ۱۹۰۰ء

علامہ شبلی کا یہ خط ان کے کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ہے، اسے سرسید اکیڈمی علی گڑھ کے ریکارڈ روم سے حاصل کر کے پروفیسر سعود عالم قاسمی نے اپنی کتاب "سرسید جدید ذہن کے معمار" (ص ۱۵۹) میں شامل کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی دینیات کے اس جلسہ میں گرچہ شریک نہ ہوسکے تاہم آئندہ سال ۱۴/ فروری ۱۹۰۱ء کے جلسہ میں جو نواب محسن الملک کی کوٹھی پر منعقد ہوا تھا، علامہ شبلی نے شرکت کی۔ (ایضاً) اس جلسہ کی ایک قرارداد یہ تھی کہ:

"سیر کی نسبت یہ قرار پایا کہ بدء الاسلام کی تکمیل مولوی شبلی صاحب کردیں"۔ (ایضاً)

بدء الاسلام کی تکمیل کی بات اور قرارداد دونوں محل نظر ہے، اس لیے کہ بدء الاسلام کی تکمیل علامہ شبلی عہد سرسید میں کرچکے تھے اور وہ رسالہ کالج کے نصاب میں شامل ہوچکا تھا، بلکہ اس قرارداد سے پہلے سرسید کی فرمائش پر اس کا فارسی میں ترجمہ بھی مولانا حمید الدین فراہی کرچکے تھے۔

علامہ شبلی فروری ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد گئے اور ۱۹۰۲ء میں سررشتہ علوم وفنون سے ان کی

کتاب الغزالی شائع ہوئی، متعدد احباب نے اس کی فرمائش کی مگر یہ اعزاز صرف نواب محسن الملک کو حاصل ہوا کہ علامہ نے ان کی فرمائش پوری کی اور الغزالی خرید کر بھیجی۔ (مکتوبات شبلی ص ۶۰)

نواب محسن الملک چاہتے تھے کہ علامہ شبلی علی گڑھ واپس آجائیں، چنانچہ انہوں نے ایک سال پہلے اگرچہ حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا تھا تاہم وہ اپنے مشن میں لگے رہے اور علامہ شبلی سے متعلق انگریزوں کے جو شکوک و شبہات تھے ان کے رفع کرنے کی کوشش کی اور جب انہیں کامیابی مل گئی اور گورنر کی طرف سے اجازت مل گئی کہ انہیں علی گڑھ بلالو تو انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ فوراً کالج واپس آجایئے۔ (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۴۰۔ ۱۴۲) یہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔

جنوری ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، نواب صاحب کی خواہش پر علامہ شبلی حیدرآباد سے آکر شریک ہوئے۔ کانفرنس کا یہی وہ اجلاس ہے جس میں کانفرنس کے مختلف شعبے قائم ہوئے اس کے ایک شعبہ انجمن ترقی اردو کا سکریٹری علامہ شبلی کو منتخب کیا گیا، جس پر وہ اخیر ۱۹۰۴ء تک فائز رہے۔ یہ سکریٹری شپ بھی نواب صاحب اور علامہ شبلی کی دوستی ہی کا نتیجہ تھی۔ علامہ شبلی جب تک اس عہدہ پر فائز رہے ترقی اردو کے لیے مسلسل جدو جہد کرتے رہے اور اس کی روداد لکھ کر نواب محسن الملک کو ماہ بہ ماہ پیش کرتے رہے۔ یہ رودادیں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کی دستیاب تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ اپریل ۱۹۰۳ء، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۳۰/ مئی ۱۹۰۳ء۔

۲۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ مئی ۱۹۰۳ء۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۳/ جون و ۲۰/ جون ۱۹۰۳ء۔

۳۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ جون ۱۹۰۳ء، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵/ جولائی ۱۹۰۳ء۔

۴۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ جولائی ۱۹۰۳ء، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۹/ اگست ۱۹۰۳ء۔

۵۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۶/ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

انجمن ترقی اردو کی یہ مفصل رودادیں جہاں علامہ شبلی کی انجمن ترقی اردو کے لیے محنت و دلچسپی سے واقف کراتی ہیں وہیں دوسری طرف محسن الملک سے ان کی بے پناہ دلچسپی کا بھی پتہ دیتی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ ان چند رودادوں کی نشاندہی باقیات شبلی کے مصنف مشتاق حسین نے کی تھیں، ممکن ہے اور بھی رودادیں شائع ہوئی ہوں کاش کوئی ان کی نشاندہی کرسکتا۔؟

جس وقت علامہ شبلی حیدرآباد کی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود ترقی اردو کے لئے مسلسل جدوجہد کررہے تھے اور اس کی رودادیں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپ رہی تھیں، عین اسی زمانہ میں کسی شخص نے نواب محسن الملک کو ایک مراسلہ لکھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۲۱/ مارچ ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا، اس مراسلہ میں علی گڑھ کالج سے متعلق بعض نازیبا باتیں لکھی گئی تھیں اور خود نواب صاحب کی نیت پر شک کیا گیا تھا۔ مراسلہ نگار نے اس عیاری سے مراسلہ لکھا تھا کہ بغیر نام لیے اس کا انتساب علامہ شبلی کی طرف ہوجائے اور یہی ہوا بھی، علامہ شبلی نے اس کی اشاعت پر سخت ناراضی ظاہر کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھا کہ:

''نواب محسن الملک نے گم نام خط چھاپنے میں سخت غلطی کی، کم سے کم مجھ سے پہلے پوچھ لینا تھا، وہ سب ایک حیدرآبادی مفسد کی کارروائی ہے''۔
(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۲)

پھر اس کے بعد خود نواب محسن الملک کو مفصل خط لکھا چوں کہ اس سے علامہ شبلی کے کالج سے متعلق بعض اہم خیالات سامنے آتے ہیں اس لیے نقل کیا جاتا ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''کون یہ گمان کرسکتا تھا کہ ایک شخص جس نے ۱۶/ برس تک کالج کی وفادارانہ ملازمت کی ہو، جس نے اپنی مشہور تصنیفات کالج کو دیا ہو، جس نے اپنے مقدور کے موافق وقتاً فوقتاً کالج کی مالی اعانت کی ہو، جو اکثر کانفرنس کے جلسوں میں اب تک شریک ہوتا رہا ہے اور جو اب بھی خواب دیکھتا رہتا ہے کہ اگر اس کو موجودہ تعلقات سے آزادی مل سکے تو پھر کالج کے احاطہ میں رہ کر سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بلا کسی مالی معاوضہ کے صرف کرے، اس کی نسبت جب ایک گمنام چٹھی چھپے اور اس میں اس کی نسبت باغیانہ خیالات منسوب کئے جائیں تو نواب محسن الملک بلا اس دریافت کے کہ نویسندہ کون شخص ہے؟ اور اس کا کیا پایہ ہے؟ اور یہ کہ نویسندہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ کسی پبلک موقع کا واقعہ ہے یا پرائیویٹ استراق سمع ہے، اس خط کو چھاپ دیں اور پھر تمام قوم میں ایک غلغلہ برپا ہوجائے اور لوگ اس کی بنیاد پر مضامین کا تار باندھ دیں، ان ھذالشی عجاب، ہمارے بزرگ مولانا حالی نے

بالکل سچ کہا ہے

اگر سن لیں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی
ہزاروں ہوں گی یہ بدفال سن کر شادیاں ہم میں
(مکتوبات شبلی ص ۳۴)

علامہ شبلی نے جس حیدرآبادی مفسد کا ذکر کیا ہے اس کی نشاندہی نہیں ہوسکی تاہم اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص ضرور تھا جسے سرسید کے بعد نواب محسن الملک سے شبلی کی قربت سوہان روح تھی، ماضی میں سرسید کے زمانہ میں بھی اس طرح کے بعض گم نام خطوط لکھے گئے تھے اور علامہ شبلی کو مطعون کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کی تفصیل حیات شبلی اور مکتوبات شبلی وغیرہ میں موجود ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰۔۱۹۶۰ء) بھی اس وقت حیدرآباد میں تھے، جن کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے علامہ شبلی پر جا و بے جا اعتراض کرنا اپنا مسلک ہی بنا لیا ہے (حیات شبلی ص ۶۹۱) علامہ شبلی کا ذہن غالباً انہیں کی طرف گیا ہو، اس لیے کہ جب مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۶ء) نے الکلام پر ایک طالب علم کے نام سے تنقید لکھی تھی اس وقت بھی ان کی نظر ان ہی کی طرف اٹھی تھی (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۹۳) اس زمانہ میں حیدرآباد میں بابائے اردو شبلی مخالف سرگرمیوں میں مصروف تھے اور وہ یہ سب کچھ سرسید اور مولانا حالی کی حمایت کے نام پر کرتے تھے، انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں علامہ شبلی پر بے جا نقد بھی کیا ہے مگر کسی ذریعہ سے اب تک اس کی تصدیق نہیں کی جاسکی ہے کہ یہ گم نام خط بابائے اردو نے لکھا تھا اور وہ حیدرآبادی مفسد کون تھا؟

مولانا شبلی کے خط کا نواب محسن الملک نے کیا جواب دیا یہ تو نہیں معلوم ہوسکا البتہ اس خط کی اشاعت سے چند دن پہلے ۲۵/اپریل ۱۹۰۳ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں "شمس العلما مولوی شبلی نعمانی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ" کے عنوان سے مرتب کی طرف سے ایک تحریر شائع ہوئی تھی، وہ تحریر یہ ہے:

> "ہم کو تو کبھی اس کا خیال نہ تھا کہ کوئی سمجھدار آدمی جو مولانا کو جانتا ہے اور ان کے مزاج اور طبیعت اور ان تعلقات سے جو ان کو کالج کے ساتھ ہیں، واقف ہے، یہ شبہہ کرے گا کہ جو باتیں حیدرآبادی صاحب نے لکھی تھیں وہ کبھی ان کی زبان سے نکلی ہوں۔ مولانا کی شان

اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے اور ہم نے تو جواب میں اپنا خیال صاف ظاہر کر دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ ہمارے کالج کا کوئی پروفیسر ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا"۔(باقیاتِ شبلی ص ۱۹۱)

اس خط کی اشاعت پر بہرحال علامہ شبلی نے ناراضی ظاہر کی، مگر نواب صاحب سے ان کے دوستانہ مراسم میں کسی طرح کا خلل واقع نہیں ہوا اور تعلقات بدستور جاری رہے اور نواب صاحب انہیں کالج سے منسلک کرنے کے لیے اس زمانہ میں بھی کوشاں رہے اور جوں ہی انہیں اطلاع ملی کہ علامہ شبلی نے حیدرآباد سے قطع تعلق کرلیا ہے، انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ "فوراً کالج میں چلے آیئے، حیدرآباد کا سابقہ وظیفہ بھی جاری ہوجائے گا اور ۱۰۰ روپیہ کالج سے بھی ملیں گے"۔(حیاتِ شبلی ص ۲۷۶)

علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج سے استعفیٰ سید محمود (۱۸۵۰۔۱۹۰۳ء) کے زمانہ میں دیا تھا، چند ماہ بعد جب نواب محسن الملک سکریٹری منتخب ہوئے اسی وقت سے انہیں واپس بلانے کے کوشاں ہوگئے۔ علامہ شبلی کبھی راضی نہیں ہوئے، ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ کے لیے نواب صاحب کے تقاضے بہت بڑھ گئے چنانچہ انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی سے مشورہ کے لیے خط لکھا کہ:

"کئی مہینہ سے نواب محسن الملک نہایت اصرار سے زور دے رہے ہیں کہ کالج آجاؤ، دوسو مشاہرہ ہوگا اور وظیفہ حیدرآباد بھی بحال رہے گا، میں سال بھر سے کوشش کر رہا تھا کہ وظیفہ بحال ہوجائے تو نوکری چھوڑ کر ندوہ میں چلا آؤں، تین ہفتے ہوئے اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔ نواب محسن الملک لکھتے ہیں کہ اگر کالج میں آؤں تو یہاں سے کوشش کرائی جائے اور وظیفہ جاری ہوجائے، اب فرمایئے کیا کروں، کالج میں ندوہ کیوں کر ہوسکے گا اور کالج میں نہ آؤں تو حیدرآباد رہ کر اور بھی ندوے سے دوری ہے، کوئی معقول رائے دیجیے"۔(مکتوباتِ شبلی ص ۱۳۶)

شروانی صاحب نے کیا رائے دی یہ تو نہیں معلوم البتہ چند ماہ بعد چند شرائط کے ساتھ علامہ شبلی علی گڑھ آنے کے لیے راضی ہوگئے اور انہوں نے نواب محسن الملک صاحب کو رضامندی کا خط بھی لکھ دیا، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"میں نے نواب محسن الملک کے خط کے جواب میں ان کو جو لکھا ہے وہ یہ کہ ۲۰۰ روپئے ماہوار کالج پر خواہ مخواہ ایک بار ہے، اس لئے میری خواہش یہ ہے کہ

میں کالج میں آکر بلا معاوضہ کام کروں، البتہ یہ چاہتا ہوں کہ سال میں میرے قیام کالج کی مدت لازمی صرف چار پانچ مہینے قرار دیئے جائیں ، باقی اختیاری ، اس صورت میں ندوہ میں کام کرنے کا اچھا موقع ملے گا۔میں نے صراحتاً یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بہر حال میں ندوہ سے عملی تعلق رکھوں گا''۔(مکتوبات شبلی ص ۱۲۲)

لیکن پھر یہ ممکن نہ ہوسکا۔

علامہ شبلی حیدرآباد سے ندوہ جانا چاہتے تھے،ان کے علی گڑھ کے احباب اسے خودکشی سے تعبیر کرتے تھے،نواب محسن الملک نے انہیں سمجھایا کہ''ندوہ کی اس کسمپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا،لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتاً تمام مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آمادہ مخالفت ہوں گے''،بقول مولانا سید سلیمان ندوی ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔(حیات شبلی ص ۵۹۴)

حیدرآباد سے علامہ شبلی کی علاحدگی کی اطلاع جب بھوپال پہونچی تو نواب سلطان جہاں بیگم انہیں بھوپال لانے کے لیے کوشاں ہوئیں اور چوں کہ علامہ سے نواب محسن الملک کی قربت جگ ظاہر تھی اس لیے انہوں نے نواب صاحب ہی کو واسطہ بنایا، چنانچہ نواب صاحب نے علامہ شبلی کو لکھا کہ:

''مولانا ! ہر ہائنس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے، فرمایئے کیا جواب دیا جائے۔

آپ کی طبیعت کیسی ہے،الندوہ کب نکلے گا،آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضرات علماء کا کیا حال ہے،مدد دیں گے یا فرنٹ ہو جائیں گے''۔(حیات شبلی ص ۴۰۸۔۴۰۹)

مولانا شبلی نے بھوپال کے قیام کو بھی پسند نہیں کیا اور احباب کے تمام خدشات کے باوجود نونہالان ملت کی خیر خواہی کے جذبات سے سرشار ندوہ آگئے اور پھر ندوہ میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اب ہماری ملی تاریخ کے المیوں میں سے ایک ہے۔

اس سال یعنی ۱۹۰۵ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہونا طے پایا تو نواب صاحب نے علامہ شبلی سے شرکت کی درخواست کی مگر شاید وہ شریک نہ ہوسکے(مکاتیب شبلی ج ا ص

(۴۶)اسی سال ایم اے او کالج کی سینٹرل کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو نواب صاحب نے علامہ شبلی کو سینٹرل کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا، مگر علامہ شبلی نے معذرت کا خط لکھا:

جناب من! ''والا نامہ ورود فرما ہوا، سینٹرل کمیٹی کی ممبری میرے لئے موجب فخر ہے، لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ بغیر کسی خدمت اور محنت کے محض فخر کے لیے اپنا نام فہرست میں لکھواؤں، میں سال بھر سے بیمار اور ضعیف ہوں، کوئی دماغی کام نہیں کرسکتا، تصنیف کا مشغلہ بالکل بند ہے، جب کسی کام کے قابل ہوں گا تو فخر سے اس عہدہ کو قبول کروں گا''۔ (مکاتیب شبلی ج۱ ص ۱۹۔۲۰)

لیکن نواب صاحب نے یہ خط واپس کر دیا اور لکھا کہ:

''یہ خط واپس ہے، منظوری کا عنایت نامہ عنایت ہو، عذر نا مسموع براہ کرم ضرور منظور فرمایئے، مجھ پر احسان ہوگا''۔(شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ص ۴۱)

علامہ شبلی کے ندوہ سے وابستہ ہوجانے کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا، چنانچہ نواب محسن الملک نے انہیں اصرار کر کے ڈھاکہ بلایا اور وہ اجلاس میں شریک ہوئے، اور ۲۲؍دسمبر کے اجلاس میں جس کی صدارت سفیر ایران مرزا شجاعت علی بیگ نے کی تھی تاریخ اسلام کے موضوع پر خطبہ دیا۔

اسی زمانہ میں ایم اے او کالج میں عربی کی ایک اعلیٰ جماعت قائم کی گئی اور اس کی تدریس کے لئے جرمنی سے جوزف ہارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے ۲۰۰ ماہوار پر علامہ شبلی کو ان کا اسسٹنٹ بنانا چاہا مگر علامہ نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ (حیات شبلی ص ۶۷۷) چند ماہ بعد فروری ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی کی خواہش پر مولانا حمید الدین فراہی کو نواب صاحب ہی نے ایم۔اے۔او کالج کا استاد منتخب کیا تھا۔(حیات شبلی ص ۷۰۹)

اس سال ندوہ کے سالانہ اجلاس میں علامہ شبلی نے نواب محسن الملک کو مدعو کیا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ شریک ہوں۔(مکتوبات شبلی ص ۳۹) لیکن یہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی کہ آیا وہ شریک ہوئے یا نہیں؟

مولانا مسیح الزماں اور بعض دوسرے علمائے ندوہ الکلام کے حوالہ سے شبلی کے عقائد پر سوالات کرنے کے لیے جس وقت جمع ہوئے اتفاقاً محسن الملک وہاں موجود تھے اور وہ الکلام لے کر

وہاں سے چلے گئے۔(یادایام ص ۶۸،۶۹)

۷ا رمئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے حادثہ پا کا سانحہ پیش آیا جس سے ملک میں کہرام مچ گیا، نثر نگاروں نے مضامین اور شعرا نے قطعات وغیرہ کے ذریعہ رنج کا اظہار کیا،اس موقع پر بھی نواب محسن الملک انہیں نہیں بھولے، چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ آپ علی گڑھ آجائیں، یہاں کے ڈاکٹر آپ کا مفت علاج کریں گے۔(حیات شبلی ص ۴۵۳) مگر علامہ شبلی وہاں نہ جاسکے اور اعظم گڑھ ہی میں علاج ہوتا رہا اور جب علامہ کسی قدر صحت مند ہو کر ندوہ لکھنو پہنچے تو نواب صاحب علی گڑھ سے عیادت کے لیے لکھنؤ آئے۔(ایضاً ص ۴۷۰)

نواب محسن الملک اور شبلی کے ربط و تعلق کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ذہنی اور کسی قدر فکری اشتراک کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔دونوں کی تعلیم و تربیت قدیم طریقہ تعلیم پر ہوئی تھی، دونوں جدید تعلیم اور روشن خیالی کے علمبردار تھے، دونوں کو سرسید مرحوم سے گہرا ربط و تعلق رہا، سرسید تو شبلی کے مربی ہی تھے، مگر اس اشتراک فکر و عمل کے باوجود دونوں کو سرسید کے مذہبی افکار سے اختلاف رہا، علامہ شبلی کے نقطہ نظر سے اہل علم واقف ہیں، کہ انہوں نے اس اختلاف رائے کا برملا اظہار کیا ہے، نواب محسن الملک کا بھی یہی نقطہ نظر تھا، اس کے بارے میں پروفیسر اصغر عباس نے لکھا ہے کہ:

> ”دونوں میں روابط کا آغاز سرسید کی تصنیف تبین الکلام فی تفسیر التوراہ والانجیل علی ملتہ الاسلام میں ان کے بعض خیالات کے اختلاف سے ہوا، بعد میں انہوں نے سرسید کی تفسیر قرآن میں ان کے بعض مضامین سے بھی اختلاف کیا، دونوں کے مابین اختلاف کا خاص مسئلہ قانون فطرت کا سرسید کا تصور ہے، ان اختلافات کی تفصیل مکاتبات الخلان میں ملتی ہے، محسن الملک کو سرسید کے بعض تہذیبی افکار سے بھی اختلاف تھا، ان کے نزدیک مغرب سے آئے ہوئے عوارض میں سب سے بڑی بیماری آزادی ہے، انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ہم نہ صرف مشرقی امراض کے لیے معالجہ کے محتاج ہیں بلکہ ہم کو ایسے طبیب کی بھی ضرورت ہے، جو مغربی بیماریوں سے بھی بچائے۔انہوں نے سائنس اور مذہب کے درمیان توازن کی ضرورت پر بھی

زور دیا، وہ جدید تعلیم کے نتائج سے بھی مایوس تھے، ان کے نزدیک اس تعلیم نے سیرتوں میں مثبت تبدیلی کے بجائے کورانہ تقلید کو فروغ دیا ہے، ۱۸۹۳ء میں جب وہ حیدرآباد سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ آئے تو یہاں علی گڑھ کالج کے انتظامی امور میں انہیں سرسید سے اختلاف پیدا ہوا، اور وہ بمبئی چلے گئے"۔ (دستاویزات محسن الملک ص ۱)

سرسید سے نواب محسن الملک کے یہ ضمنی اختلافات اخیر تک قائم رہے اور ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ (حیات محسن ص ۲۰۹)

پروفیسر اصغر عباس کے مذکورہ اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں اور علامہ شبلی کے نقطۂ نظر میں کس قدر ہم آہنگی تھی، البتہ علامہ شبلی سرسید کے مذہبی افکار کے ساتھ ان کے سیاسی افکار کے بھی ناقد تھے اور اس کو پسند نہیں کرتے تھے جب کہ نواب صاحب ہم نوا تھے:

اسی سال ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو نواب محسن الملک نے شملہ میں وفات پائی، علامہ شبلی اس وقت لکھنؤ میں تھے، اس خبر سے دل برداشتہ ہوئے، انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں "ہائے محسن الملک" کے عنوان سے وفیات لکھی اور سخت ماتم کیا، اس وفیاتی نوٹ کا ایک ایک حرف غم ناک ہے۔ اس میں پہلے نواب صاحب کی شخصیت اور خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے کارناموں کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، لکھتے ہیں:

> "مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی نادرہ روزگار تھے، اس درجہ اس عزت، اس رتبہ پر ان کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ درجہ کے آدمیوں سے بہ ادب و عزت ملتے تھے، ملاقات میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے، سب سے جھک کر ملتے تھے، اس کے ساتھ نہایت فراخ حوصلہ، فیاض، سخی اور جواد تھے اور یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے انہوں نے عالم کو مسخر کرلیا تھا"۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۹۳)

علامہ شبلی کے دلی رنج و غم بلکہ دلی جذبات کا اندازہ وفیاتی مضمون کے آخری چند جملوں سے ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> محسن الملک ! جا اور خوش خوش خدا کے سایۂ رحمت میں آرام کر، تو درد بھرا دل رکھتا تھا، لوگ تیرے لیے بھی روئیں گے اور بہت روئیں گے۔

در روزگارِ عشق تو ماہم فدا شد بم
افسوس کز قبیلہ مجنوں کسے نماند

(ایضاً ص ۱۹۴)

غرض نواب محسن الملک اور علامہ شبلی میں ہمیشہ گہرے مراسم و تعلقات رہے، دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور اخیر تک خیر خواہ رہے، جن اہل قلم نے علامہ شبلی کو علی گڑھ تحریک کا مخالف قرار دیا ہے شاید ان کی نظر شبلی کے کالج سے مستعفی ہوجانے کے بعد کالج اور خصوصاً نواب محسن الملک مرحوم سے قربی اور نج کے تعلقات پر نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کالج کے ہمیشہ خیر خواہ رہے، اور ان سے جو کچھ بن پڑا وہ کرتے بھی رہے، آخری دور میں یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے کالج کو یونیورسٹی بنانے کی جدوجہد میں ان کا بھی حصہ ہے جس کا خاطر خواہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کا سرسید، محسن الملک اور کالج سے تعلق کبھی کم نہیں ہوا۔

کتابیات

۱۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، علی گڑھ طبع اول، ۱۹۰۷ء۔
۲۔ آثارِ شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔
۳۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین آزاد کتاب گھر، دہلی ۱۹۶۴ء۔
۴۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء۔
۵۔ حیات محسن، منشی امین زبیری، ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۱۹۳۴ء۔
۶۔ دستاویزات محسن الملک، پروفیسر اقبال حسین، سرسید اکیڈمی علی گڑھ، ۲۰۰۷ء۔
۷۔ سرسید جدید ذہن کے معمار، پروفیسر سعود عالم قاسمی، شعبہ تھیالوجی علی گڑھ، ۲۰۱۷ء۔
۸۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔
۹۔ مقالات شبلی جلد ہشتم، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔
۱۰۔ مکاتیب شبلی، جلد اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔
۱۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء۔
۱۲۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔
۱۳۔ یاد ایام، مولانا ضیاء الحسن علوی، ادارہ انیس اردو الہ آباد، ۱۹۵۹ء۔

امریکہ میں ایونجلسٹ اثرات اور اس کے عالمی مضمرات

ڈاکٹر اسلم عبداللہ

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی قیادت میں امریکہ، مذہبی جنون پسندی ہی نہیں بلکہ سفید فام نسل پرستی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہ مذہبی جنون اور سفید فام نسل پرستی نہ صرف امریکی سیاست بلکہ عالمی سیاست پر بھی اثر انداز ہورہی ہے۔ صدر ٹرمپ کے دور قیادت میں عیسائی بنیاد پرستی کے اثرات امریکی سیاست، معیشت اور معاشرت کے ہر شعبہ میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔(۱)

عیسائی بنیاد پرست تنظیموں نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ اگر عیسائیوں نے صدر ٹرمپ کی مخالفت کی تو وہ اللہ کو ناراض کردیں گے اور نہ صرف اپنے اوپر بلکہ آنے والی نسلوں پر اللہ کے عتاب کے نزول کا سبب بنیں گے۔ ان بنیاد پرست عیسائیوں کے گرجا گھروں میں صدر ٹرمپ کی سلامتی کے لیے تقریباً ہر ہفتہ ہی دعائیں مانگی جاتی ہیں اور معتقدین کو باور کرایا جاتا ہے کہ اگر صدر ٹرمپ کو نہ بچایا گیا تو عیسائیت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

۲۰۱۶ء کے صدارتی انتخابات میں تقریباً ۸۰ فیصد سے زائد عیسائی بنیاد پرستوں نے ٹرمپ کے حق میں اپنی انتخابی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ان کے نزدیک ٹرمپ کا انتخاب خود اللہ نے کیا ہے۔

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے ان اسباب کا سمجھنا ضروری ہے جو اس کے ذمہ دار ہیں۔

صدر ٹرمپ نے اپنی دو بیویوں کو نہ صرف طلاق دی، بلکہ ان کی جنسی بے راہ روی کی داستانیں بھی عام ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنے قول وعمل سے انہوں نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ وہ خواتین کو گری

امریکہ۔ چیف ایڈیٹر ''مسلم آبزرور''۔

ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے امریکی عوام کے سامنے کبھی بھی اپنے ٹیکس کی تفصیلات فراہم نہیں کیں۔

اس کے باوجود بنیاد پرستوں کے رہنما جیری فالویل جونیئر اور فرینکلن گراہم ان کو عیسائیت کے بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر ٹرمپ کی مدد سے ہی وہ اور ان کے حواری، ثقافتی اور مذہبی جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

ان عیسائی قائدین کی نظر میں عیسائیت حالت جنگ میں ہے اور اس جنگ میں صدر ٹرمپ ہی ان کو کامیابی دلا سکتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انہیں صدر ٹرمپ کے ذاتی کردار سے کوئی مطلب نہیں کیونکہ ان کے نزدیک بائبل یا عہد نامہ عتیق میں درج ہے کہ اللہ نے ایک کافر فرماں روا کو یہودیوں کی نجات کے لیے چنا تھا۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ نعوذ باللہ ''داؤد نے زنا کیا'' لیکن پھر بھی اللہ نے انہیں اسرائیل کی بادشاہت عطا کی۔(۲)

ان کے نزدیک اللہ صدر ٹرمپ کو استعمال کر رہا ہے عیسائیت کے فروغ کے لیے اور عیسائیت کا فروغ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب امریکہ اسرائیل کے تحفظ میں پیش پیش رہے اور ایسے ججوں کا تعین کرے جو سپریم کورٹ کے فیصلے عیسائیت کی بنیاد پر کریں۔(۳)

بائبل کو اپنی بنیاد بناتے ہوئے یہ عیسائی قائد کہتے ہیں کہ زبور میں لکھا ہے کہ میرے چنیدہ قائدین کو اذیت نہ دو اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ۔(بائبل ۱۰۵:۱۵)

صدر ٹرمپ اور ان کی ریپبلکن پارٹی اسرائیل اور سپریم کورٹ کے ججوں کی نامزدگی کے مسئلہ میں عیسائی بنیاد پرستوں کے ساتھ ہے۔چنانچہ امریکہ نے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی تسلیم کرنے کا فیصلہ عیسائی بنیاد پرستوں کی ایما پر لیا اور سپریم کورٹ میں نظریاتی طور سے عیسائی بنیاد پرستوں کے ترجمان جج متعین کرنے کی کوشش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔(۴)

اس سیاسی صورت حال کو سمجھنے کے لیے ہمیں امریکہ کا مذہبی نقشہ سمجھنا ہوگا اور بنیاد پرستوں کے مقاصد سے آگہی حاصل کرنا ہوگی۔

امریکہ میں عیسائیت کے مختلف فرقے شروع ہی سے موجود رہے ہیں۔نوآبادیاتی نظام سے قبل امریکہ میں عیسائیت کا وجود نہیں تھا لیکن مقامی باشندے اپنے انداز سے روحانیت اور

مذہبیت سے جڑے ہوئے تھے۔نوآبادیاتی نظام کے بعدامریکہ میں پروٹسٹنٹ،کیتھولک،اینگلکن اورآرتھوڈاکس عیسائیوں نے آباد ہونا شروع کیا۔ان فرقوں نے اپنی اپنی تنظیمیں قائم کیں اوراپنے اپنے عقائدکونئے انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی۔اوراس نئے اندازفکر نے نئے نئے فرقوں کوفروغ دیا۔

۱۹۸۵ء کے بعدامریکہ میں دیگر مذاہب کے اثرات بھی پھیلتے ہوئے نظرآتے ہیں۔ان میں بودھ مذہب،ہندومذہب اوراسلام اوریہودیت خاصے نمایاں تھے۔

۲۰۱۶ءکےاعدادوشمار کےمطابق امریکہ میں عیسائیوں کی تعداد ۷۳.۷ فیصد ہے،ان میں ۴۸.۹ فیصد پروٹسٹنٹ ہیں۔ ۲۳ فیصد کیتھولک ہیں اور ۱.۸ فیصد مورمن ہیں۔ ۱۸.۲ فیصداپنے آپ کوکسی مذہب سے وابستہ نہیں کرتے۔یہودی آبادی ۲.۱ فیصد ہے جبکہ مسلمان ۰.۸ فیصد ہیں۔عیسائی بنیاد پرستی سے عقیدت رکھنے والوں کی بڑی تعدادامریکہ کی جنوبی ریاستوں میں ہے۔

ان عقیدت مندوں کی اکثریت عیسائی بنیاد پرست یاایونجلسٹ عیسائیوں پرمبنی ہے یہ ایونجلسٹ زیادہ تر پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نجات اسی وقت ممکن ہے جب یقین کیا جائے کہ انسانیت کے گناہوں کا کفارہ حضرت عیسیٰ نے صلیب پر چڑھ کرادا کیا۔ان کا عقیدہ ہے کہ اس اصول کی بنیاد پرتجدید دین ضروری ہے۔بائبل کوحتمی کتاب ماننا ضروری ہے اور عیسائیت کےفروغ کے لیے ہر چیزقربان کردیناضروری ہے۔

عیسائیت میں اس تحریک کا آغاز ۱۷۳۸ء سے ہواجب مختلف عیسائی مبلغین نے درج بالا عقائدکی بنیاد پرگرجا گھروں کومنظم کرنے کی کوشش کا آغازکیا۔اس تحریک کے قائدین میں درج ذیل نام قابل ذکر ہیں،جان ویزلی،جارج وہائٹ نیلٹ،بلی گراہم،بل رائٹ،ہیرالڈ جان اوکینگا،جان سٹاٹ اور مارٹن لائیڈ جونز۔

دنیامیں سب سے زیادہ ایونجلسٹ امریکہ میں ہی پائے جاتے ہیں۔امریکہ میں ان کی تعداد ۲۵ فیصد سے زائد ہےاورامریکہ میں یہ سب سے بڑا مذہبی گروہ ہے۔یہ عیسائی گروہ بڑی تیزی سے دنیامیں اپنے اثرات بڑھارہاہے۔

اٹھارہویں صدی میں اس گروہ نےاپنے اثرات پھیلانےشروع کیےاورابتدامیں برطانیہ اور اس کے زیراثرنوآبادی ملکوں میں اس نے پھیلنا شروع کیا۔آج دنیا کےتقریباً ہر ملک میں اس تحریک

کے ماننے والے موجود ہیں۔اس گروہ کی ایک عالمی تنظیم ہے جس سے تقریباً سو سے زائد تنظیمات جڑی ہوئی ہیں۔اس عالمی تنظیم کا نام ہے الحاق برائے عالمی ایونجلسٹ اور دنیا کے ۱۲۹ ممالک میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔آج دنیا میں اس کے ماننے والوں کی تعداد ۶۳۰ ملین ہے یعنی عالمی عیسائی آبادی کا ۲۸ فیصد۔

امریکہ میں تقریباً ۲۲ فیصد کیتھولک اور ۱۶ فیصد پروٹسٹنٹ ایونجلسٹ کے زمرے میں آتے ہیں۔امریکہ کی قومی سیاست میں عیسائی متبشرین کی تعداد خاصی بڑی ہے۔

امریکہ کے دونوں ایوانوں میں ۴۸۵ عیسائی ہیں، یہودی ۳۰ ہیں، بودھ اور ہندو تین، مسلمان دو اور دیگر ۱۲ ہیں۔عیسائی قانون سازوں میں ۲۹۹ پروٹسٹنٹ، ۱۶۸ کیتھولک، ۷ ۱۳ مورمن اور پانچ آرتھوڈاکس ہیں۔ریپبلکن پارٹی کے ۲۹۳ ممبران میں ۲۹۱ عیسائی ہیں، جبکہ ڈیموکریٹک پارٹی میں ۲۸ یہودی، تین ہندو، تین بودھ اور دو مسلمان بھی ہیں۔

ریپبلکن پارٹی کے ممبران کی اکثریت عیسائی ایونجلسٹ عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے۔

عیسائی ایونجلسٹ امریکہ میں اسرائیل کے سب سے بڑے حامی ہیں۔انہی کی ایما پر صدر ٹرمپ نے یروشلم کو اسرائیل کی راج دھانی تسلیم کیا اور سپریم کورٹ کے متنازعہ جج کا تعین کیا۔ان کے قائد ہر ہفتہ وہائٹ ہاؤس میں صدر ٹرمپ سے ملاقات کرتے ہیں۔ان کو دعائیں دیتے ہیں اور ان سے قومی اور عالمی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔وہائٹ ہاؤس میں موجود ملازمین سے ان کے گہرے روابط ہیں اور ان کے مشورے کے بغیر کوئی پالیسی آگے نہیں بڑھتی۔

ان ایونجلسٹ عیسائیوں کے بنیادی عقائد درج ذیل ہیں:

انسانیت اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہے اور عالمی انسانی امور میں حضرت عیسیٰ کی مداخلت کے بغیر انسانیت کی بقا ممکن نہیں۔جوہری ہتھیاروں کا فروغ انسانیت کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور صرف ایک عیسائی امریکہ ہی اس تباہی سے دنیا کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی مداخلت اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب یہودیوں کا ملک اسرائیل محفوظ ہو اور یروشلم اس کی راجدھانی ہو۔ایونجلسٹ کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی آمد سے قبل یروشلم دشمنوں سے گھر جائے گا اور اس کی تباہی سامنے نظر آرہی ہوگی۔ان کا عقیدہ ہے کہ یروشلم چار سو سال تک ناپاک ہاتھوں میں رہا۔بالآخر ایک اسرائیلی ریاست وجود میں آئی اور حضرت عیسی کی واپسی ممکن ہوئی۔

یہ رہنما عہدنامہ عتیق کی درج ذیل کتاب کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ جو کوئی یروشلم کے خلاف اٹھے گا اسے اللہ تباہ کر دے گا۔(بائبل، ۱۲:۹)

حضرت عیسیٰ کی واپسی اسی وقت ممکن ہوگی جب شمال اور جنوب میں دو طاقتور حکمراں ہوں گے اور ان حکمرانوں میں شمالی خطہ کا حکمراں کامیاب ہوگا اور امریکہ وہ ملک ہے جو شمالی خطہ کی قیادت کا اہل ہے اور صدر ٹرمپ امریکہ کے وارث ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی واپسی اسی وقت ممکن ہوگی جب یورپ ایک مستقل اکائی کی حیثیت سے طاقتور ہو جائے گا اور شمالی خطہ کا حکمراں اس کی طاقت کو کمزور کرے گا۔

حضرت عیسیٰ کی واپسی اسی وقت ممکن ہوگی جب اسرائیل اور امریکہ دنیا میں معتوب ہو جائیں گے اور اسرائیل طاقتور ہونے کے بعد بکھرنا شروع ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ کی واپسی کے لیے ضروری ہے کہ بائبل پوری دنیا میں پڑھی جانے لگے اور دنیا کے لوگ اس کو حتمی کتاب مان کر اس پر عمل کرنے لگیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب امریکی سیاست ایونجلسٹ کے ہاتھ میں آجائے۔

حضرت عیسیٰ اسی وقت واپس آئیں گے جب دنیا ایک واحد مواصلاتی نظام سے جڑ جائے گی۔

عیسائی ایونجلسٹ قائد عہدنامہ عتیق اور جدید کی تحریر کی بنیاد پر اپنے ان عقائد کو صحیح مانتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا ظہور اب کسی وقت بھی ہوسکتا ہے۔ان کے ظہور کے وقت درج ذیل واقعات رونما ہوں گے:

فرشتوں کے سردار میکائیل بگل بجا کر حضرت عیسیٰ کی آمد کا اعلان کریں گے۔

حضرت عیسیٰ فضا میں تیرتے ہوئے نیچے اتریں گے۔

انسانوں کی ہیئت تبدیل ہو جائے گی، بیماری،موت اور بھوک مری ختم ہو جائے گی اور انسان حضرت عیسیٰ کا نظارہ کریں گے۔

عیسائی ایونجلسٹ کا دعویٰ ہے کہ ۲۰۲۱ء سے دنیا کی تباہی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ۲۰۲۸ء میں حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوگا۔ان کی قیادت میں اسرائیل اپنے تمام دشمنوں کو شکست دے دے گا۔

یہودی اس کے بعد عیسائیت قبول کرنے لگیں گے اور وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ

حضرت عیسیٰ ہی اصل مسیح ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے ظہور سے قبل یہودی اپنا صومعہ تعمیر کریں گے اور وہاں وہ قربانی کی رسم کی بھی تجدید کریں گے۔

عیسائی قائدین کے مطابق جو یہودی حضرت عیسیٰ کو اپنا مسیح نہیں مانیں گے وہ ختم کردیے جائیں گے، بائبل کے مطابق دو تہائی سے زائد یہودی تہہ تیغ کردیے جائیں گے۔ ۱۹۹۴ء میں ایک عیسائی مبلغ بیل لنڈسے نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''کرۂ ارض ۲۰۰۰''۔ بائبل کی کتاب زکریا (۱۲: ۱۴) کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''ظہور عیسیٰ کے وقت یہودی بدترین کیفیت سے گزریں گے، ان کے جسم سے گوشت گرنا شروع ہوجائے گا۔ ان کی پتلیاں آنکھوں سے باہر آجائیں گی اور ان کی زبان ان کے منہ سے ابل پڑے گی۔ ان کی لاشوں سے خون کا ایک ایسا دریا رواں ہوگا جو پانچ فٹ گہرا ہوگا''۔

ان عیسائی مبلغین کے مطابق زندہ صرف وہ لوگ رہیں گے جو حضرت عیسیٰ کے ذریعہ نجات پر یقین رکھتے ہیں۔

پچھلے دو ہزار سال سے عیسائی حضرت عیسیٰ کی واپسی کے منتظر ہیں، ان دو ہزار سال میں عیسائی مبلغین نے تقریباً ۶۵ مرتبہ حضرت عیسیٰ کی واپسی کی تاریخ کا اعلان کیا لیکن ہر مرتبہ انہیں اپنی تاریخ کو ملتوی کرنا پڑا۔

سب سے پہلے تین عیسائی مذہبی علماء نے ۵۰۰ سال بعد از مسیح حضرت عیسیٰ کی واپسی کی پیشین گوئی کی تھی۔ مستقبل کی پیشین گوئیوں کے مطابق حضرت عیسیٰ ۲۰۱۹ء میں واپس آئیں گے اور ان کی واپسی کا دن ۸/جون ہے۔ یہ پیشین گوئی رونالڈ وین لینڈ کی ہے۔

جین ڈکس کی پیشین گوئی ہے کہ ان کی آمد ۲۰۲۰ء اور ۲۰۳۷ء کے دوران ہوگی۔

کینٹن میشور کا کہنا ہے کہ وہ ۲۰۲۱ء اور ۲۰۲۸ء کے دوران آئیں گے۔

کچھ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ ۲۰۲۴ء میں لوٹیں گے۔

السید بیلی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ۲۰۲۵ء میں لوٹیں گے۔ جیکب لوریر کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ ۲۰۳۰ء اور ۲۰۳۳ء کے درمیان لوٹیں گے اور فرینک پٹر کا کہنا ہے کہ ۲۰۵۷ء تک حضرت عیسیٰ کی واپسی یقینی ہے۔ ان عیسائی مبلغین، مفکرین اور رہنماؤں کے مطابق امریکہ

حضرت عیسیٰ کی واپسی میں اہم کردار ادا کرے گا، ایک ایسا کردار جس کی ابتدا صدر ٹرمپ نے شروع کردی ہے۔ یہ شروعات یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی کی شکل میں قبول کرنے سے ہوتی ہے اور اسرائیل کے دشمنوں کا خاتمہ اس کی آخری کڑی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء سے اب تک امریکہ اسرائیل کو ۱۳۴/ارب ڈالر سے زائد امداد دے چکا ہے۔ اقوام متحدہ میں امریکہ نے ۴۳ مرتبہ اسرائیل کے حق میں اپنے ویٹو کا استعمال کیا ہے۔

عیسائی ایونجلسٹ ہر ماہ اپنے پیروکاروں کے لیے اسرائیلی دورے کا اہتمام کرتے ہیں جہاں انہیں حضرت عیسیٰ کی واپسی کے لیے اسرائیل کے بقا کی ضرورت پر تقاریر سنائی جاتی ہیں۔ یہی نہیں امریکہ کے اکثر گرجا گھروں میں حضرت عیسیٰ کی واپسی اور اسرائیل کی اہمیت پر اتوار کے دن خطبات کے علاوہ کانفرنسیں اور مذاکرات بھی ہوتے رہتے ہیں۔

عیسائی مبلغین کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کی سہولیات حاصل ہیں۔ تقریباً ۲۴۰۰ ریڈیوں اور ۱۰۰ سے زائد ٹیلی ویژن ان کے کنٹرول میں ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں ان کے قانون سازوں کی بھاری اکثریت ہے۔

صدر ٹرمپ کی کامیابی میں ان گروہوں نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور اب امریکی انتظامیہ کے تعاون سے ان کے اثرات نہ صرف امریکہ میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی بڑھتے جارہے ہیں۔

امریکہ آہستہ آہستہ عیسائی ایونجلسٹ کے نرغے میں آتا جارہا ہے اور صدر ٹرمپ کا انتظامیہ اس کام میں ان کی خاموشی سے مدد کررہا ہے۔

ان کے قائدین میں کئی کو کلیدی عہدہ دیا گیا ہے، کئی قائدین کو اقتصادی معاونت دی گئی ہے اور ریپبلکن پارٹی کے توسط سے ایسے سیاست دانوں کو فروغ دیا جارہا ہے جو عیسائی بنیاد پرستوں کی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

بظاہر مذہبی آزادی پر یقین رکھنے والا ملک امریکہ ایک ایسی ڈگر پر جانکلا ہے جہاں سفید فام نسل پرستی اور عیسائی بنیاد پرستی اس کے مستقبل کو اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ کس حد تک وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہوں گے، اس کا جواب صرف اور صرف ان عیسائیوں کی طرف سے آئے گا جو ان کی فکر سے اتفاق نہیں رکھتے لیکن ایسے عیسائیوں کی تعداد ابھی کم ہے جو یہ یقین رکھتے ہوں کہ

حضرت عیسیٰ کی واپسی اسرائیل کے بقا اور یہودیوں کے خاتمہ سے منسلک نہیں ہے۔(۵)

حواشی

(۱) نومبر ۲۰۱۸ء میں امریکہ کے عوام نے وسط مدتی انتخابات میں حصہ لیا۔صدر ٹرمپ کی ریپبلکن پارٹی کے کئی امیدوار ایسے تھے جو نہ صرف سفید فام نسل پرستی کے نقیب ہیں بلکہ عیسائیت کے فروغ کے لیے انتہاپسند اقدامات اٹھانے کے بھی حامی ہیں۔

امریکی ریاست واشنگٹن کی اسمبلی کے ایک رکن ایسے ہی خیالات کے حامی ہیں،ان کا تعلق ریپبلکن پارٹی سے ہے اور انہوں نے اپنے دینی اسکول کے لیے بائبل کے کچھ قوانین پر مشتمل سبق تیار کیے ہیں۔انہوں نے لکھا کہ بائبل کے قوانین ملک میں نافذ ہونے چاہییں اور اگر کوئی ان سے انکار کرے تو اگر وہ مرد ہے تو اس کا قتل واجب ہے ان قانون ساز کا نام ہے نیٹ شے۔

اسی طرح امریکہ کی نارتھ کیرولائنا ریاست کی اسمبلی کے رکن ہیں۔ان کا تعلق بھی صدر ٹرمپ کی پارٹی سے ہے انہوں نے حال ہی میں الیکشن کے دوران بیان دیا کہ دنیا میں امن اسی صورت سے قائم ہوسکتا ہے جب مسلمان اور یہودی عیسائی مٹ جائیں۔

امریکی کانگریس کے سابق اسپیکر نیوٹ گنگرچ نے بھی انتخابات سے قبل بیان دیا کہ جو امریکی مسلمان شریعت سے وفاداری کا اظہار کرے اسے ملک سے نکال دیا جائے۔

(۲) عہد نامہ عتیق (اولڈ ٹیسٹامنٹ) کی کتاب سیموئیل میں اس واقعہ کو درج کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد کی فوج میں ایک سپاہی تھا جس کا نام یریا تھا،اس کی بیوی کا نام بیتھ شیبا تھا۔حضرت داؤد نے اس سپاہی کو جنگی مہم پر بھیجا تا کہ وہ اس کی بیوی سے تعلقات قائم کرسکیں (نعوذ باللہ)۔(سیموئیل،کتاب دوئم)

(۳) چنانچہ امریکی صدر نے نومبر میں ایک عارضی اٹارنی جنرل کا تعین کیا جن کا نام ہے وہٹیکر۔ان کا کہنا ہے کہ جج اگر بائبل کے مطابق فیصلے نہ کریں تو انہیں برخواست کردینا چاہیے۔

(۴) پریئر گرام عیسائی بنیاد پرستوں کی طرف سے دعاؤں کی ترویج کا ایک برقی ذریعہ ہے، ہر روز کروڑوں عیسائیوں کو دعائیں نذر کی جاتی ہیں،ایک دعا یہ بھی ہوتی ہے:

"اگر ہم اسرائیل کا ساتھ دیں خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو تو اللہ ہمارا ساتھ دے گا، ہمارا

صدر اسرائیل کے ساتھ ہے تو اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے"۔

(۵) جس طرح عیسائیوں کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ بائبل میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور اس کا ایک ایک لفظ سچا ہے تو اسی طرح ایک عام ایونجلسٹ یہ یقین رکھتا ہے کہ بائبل میں درج شدہ ہر پیشین گوئی سچ ثابت ہوگی۔

ایونجلسٹ کا کہنا ہے کہ سفید فام نسل اعلیٰ نسل ہے اور عیسائیت کا فروغ اسی نسل کے ذریعہ ہوا ہے اور آیندہ بھی ہونا ہے اور اس کے لیے اللہ نے ٹرمپ اور ان کے ہم نواؤں کو چن لیا ہے جو ریپبلکن پارٹی کی قیادت کر رہے ہیں۔ یہ ایونجلسٹ ہر اس پارٹی کے کارکن کے خلاف ہیں جو اسرائیل کا حامی نہ ہو اور بائبل پر مشتمل نظام کا علم بردار نہ ہو۔

ایونجلسٹ کی ایما پر ریپبلکن پارٹی کی قیادت آئے دن اسلام کے خلاف زہر اُگلتی رہتی ہے اور مسلمانوں کو اذیت دیتی رہتی ہے، یہ قیادت کہتی ہے کہ اسلام کوئی دین نہیں ہے بلکہ شخصیت پرستی پر مبنی ایک تحریک ہے جو تشدد اور خوں ریزی کے ذریعہ امریکہ اور مغربی تہذیب کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ آئے دن ایونجلسٹ کی جانب سے ایسے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں جو اسلام کو ایک معتوب دین کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

ایونجلسٹ کی بڑی تعداد ان عیسائیوں پر مشتمل ہے جو ہائی اسکول سے زائد تعلیم یافتہ نہیں ہیں جو دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور جن کا ربط کبھی کسی غیر عیسائی سے نہیں ہوا۔

ایونجلسٹ ان افراد کی مدد سے اپنے خیالات کو فروغ دیتے ہیں۔ کیونکہ امریکہ کا انتخابی نظام اس طرح سے قائم کیا گیا ہے جہاں ایسے لوگوں کی نمایندگی امریکی سینٹ میں آسانی سے ہوتی ہے، اس لیے سیاسی طور پر ان کا غلبہ رہتا ہے۔ امریکی سینٹ سو ممبران پر مشتمل ہے اس سینٹ میں ۲۰ ممبران ان ریاستوں سے آتے ہیں جہاں ملک کے پچاس فیصد لوگ رہتے ہیں اور جہاں ملی جلی اور مخلوط آبادی ہے۔ جبکہ ۸۰ ممبران ان ریاستوں سے آتے ہیں جہاں ایونجلسٹ کی خاصی تعداد رہتی ہے جو سفید فام نسل پرستی پر یقین رکھتی ہے اور اسی ایونجلسٹ طاقت کی بنیاد پر صدر ٹرمپ ہر وہ کام کر رہے ہیں جو ان کے ایجنڈے کو فروغ دے رہا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے چند غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ـ۱۹۷۷) علمی و ادبی دنیا کے معروف انشا پرداز، صحافی، ناقد، مفسر قرآن، ماہر اسلامیات اور قوم و ملت کے مخلص رہنما تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی عیسوی میں علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں، جنہیں ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آج سے ۵۶ سال قبل یعنی ۱۹۶۲ کی بات ہے۔ جب میں معروف علمی و دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کا ایک ادنی طالب علم تھا تو خارجی اوقات میں عربی و فارسی کے علاوہ اردو زبان و ادب کی اہم اور معیاری کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین آزاد، مولانا حالی، علامہ اقبال کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیفات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا تھا۔ کیونکہ ان کا اسلوب بیان نہایت دلچسپ، خوبصورت، پرکشش اور انشا پردازی سے بھرپور اور سب سے جدا تھا، جو میرے دل کو موہ لیتا تھا۔

اس زمانے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے دو چیزوں کا بڑا دھن سوار تھا۔ ایک اردو زبان کی معیاری کتابوں کا مطالعہ۔ دوسرے خط و کتابت کے ذریعہ معروف اہل قلم سے روابط اور ان سے صلاح و مشورہ۔ صلاح و مشورہ کے لیے میری نظر انتخاب سب سے پہلے جس ذات گرامی پر پڑی وہ تھے مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا دریابادی کا پوری علمی و ادبی دنیا میں غلغلہ تھا جبکہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی طالب علم تھا، لیکن مولانا دریابادی کا کمال اخلاق یہ تھا کہ انہوں نے مجھ جیسے طالب علم کو اپنے علمی فیوض برکات سے کبھی محروم نہیں رکھا۔ بلکہ میرے ہر خط کا نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ جواب دیا۔ جواب بھی ایسا جوان کی ذرہ نوازی اور علم پروری پر مبنی تھا۔ میں نے اپنی پوری بے بضاعتی کے

گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ، بہار۔

باوجود بڑی ہمت کر کے مضمون نگاری کے سلسلہ میں ان کی خدمت میں جون ۱۹۶۲ء کے اوائل میں خط ارسال کیا۔ مجھے امید کم تھی کہ وہاں سے کوئی جواب آئے گا۔لیکن دوسرے ہی ہفتہ دیکھا کہ میرے پتہ پر ایک خط پہنچا جس کے آخر میں عبدالماجد لکھا تھا، یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ پڑھ کر مولانا دریابادی کے اخلاق کریمانہ پر نازاں ہوا۔اس خط کو کئی بار پڑھا اور ہر بار انبساط محسوس کیا۔خط آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ مولانا دریابادی نے ایک معمولی طالب کو کیسا جواب دیا ہے اور کیسی حوصلہ افزا باتیں کہی ہیں۔

بسم اللہ

دریاباد

۱۳/ جون ۱۹۶۲

وعلیکم السلام

یکلخت ایسی فرمائش کر بیٹھنا ذرا عجیب سی بات ہے۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ استعداد کیا ہے اور مصنّفین میں کس کس کی کیا کیا کتابیں پڑھی ہیں۔ پسند کس کس کی کیا کیا چیزیں آئی ہیں۔ بغیر اس قسم کے معلومات کے کوئی جواب کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ والسلام عبدالماجد

اس خط کا آنا تھا کہ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا، جو ساڑھے چار سال (۱۹۶۲۔۱۹۶۶) تک چلتا رہا، اس دوران اپنے ہر خط میں علمی و ادبی سوالات کرتا یا اپنی مضمون نگاری کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتا۔ مولانا کی محبت و شفقت یہ تھی کہ وہ میرے ہر خط کا جواب نہایت پیار و محبت سے دیتے۔ حوصلہ افزائی کرتے۔ ۲/ جولائی ۱۹۶۲ء کو میں نے ایک دوسرا خط لکھا جس میں اسلام کے مساوات اور آقا و غلام کے فرق پر سوال کیا تھا۔ مولانا نے فوراً اس کا جواب دیا۔ جواب بھی ایسا جس میں اس مسئلے کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس خط کو آپ بھی پڑھیے اور مولانا عام فہم اسلوب بیان کی داد دیجیے۔

بسم اللہ

دریاباد

۱۳/ اگست ۱۹۶۳ وعلیکم السلام

جو مسئلہ کتاب و سنت میں مجمل بیان ہوا ہو اس کا اجمال قطعی صورت میں کوئی کیسے رفع

کردے؟ تعبیر وتشریح میں تو اختلاف ہمیشہ باقی رہے گا اور ہر فریق اپنی فہم وبصیرت کے مطابق صرف دلائل ہی پیش کرے گا۔ تعیین شخصیت ذوقرنین بھی اسی قسم کے مسائل میں سے ہے۔(۱)

۲۔ میں نے اپنی کسی اور کتاب کو نہیں صرف ایک فلسفۂ اجتماع کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کیا ہے، اس میں متعدد باتیں ضلالت صریح کی آ گئی ہیں۔(۲)

۳۔ اس کا جواب مشکل ہے، اپنے لیے نمبر اول پر سرمایہ سعادت اپنی تفسیر اردو (طبع ثانی ہنوز غیر مطبوع) کو سمجھتا ہوں، پھر انگریزی تفسیر کو پھر سیرۃ نبوی قرآنی اور بشریت انبیاء اور شرح مناجات مقبول اور سفر حجاز کو، ایک دوسرے معیار سے محمد علی ذاتی ڈائری اور حکیم الامت کو ایک اور معیار سے نشری تقریروں کو۔(۳)

اس کا جواب بہت تفصیل اور طویل وقت چاہتا ہے۔ والسلام عبدالماجد

ستمبر ۱۹۶۴ء کے اوائل میں میں نے ایک خط لکھا جس میں سوال کیا کہ ابن تیمیہ کا مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے۔ لیکن دلیل وہ قرآن پاک کی آیت الرحمٰن علی العرش سے پیش کرتے ہیں جو ظاہری معنی کے لحاظ سے صحیح ہے۔ جبکہ علمائے متکلمین اسلام ان کی تاویل کرتے ہیں اور اس کا عام معنی مراد لیتے ہیں۔ میرے خیال میں ابن تیمیہ کا مسلک زیادہ بہتر ہے۔ جیسے بادشاہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ پر ہوتا ہے لیکن اس کے کارندے ملک میں پھیلے ہوتے ہیں اور تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو عرش پر متمکن تسلیم کیا جائے اور اس کے فرشتے تمام نظام کائنات کو اس کے حکم سے چلا رہے ہیں۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ بلاوجہ کے تاویل کا راستہ کیوں اختیار کیا جائے۔ مولانا دریابادی نے میرے اس سوال کا جواب نہایت عالمانہ ومتکلمانہ انداز میں دیا ہے، جو یہ ہے۔

بسم اللہ

دریاباد

کھلا ہوا قیاس مع الفارق، بادشاہ بے چارہ تو محدود وجسم والا، محدود قوت والا ہے، اس کے لیے ہر جگہ ہر آن موجود ہونا کیوں کر ہو۔

عرش پر کوئی تجلی خصوصی ہوگی۔ یہ کیا ضرورت تھی کا سوال بڑا خطرناک ہے، عرش پر

متمکن ہونے میں کیا ضرورت تھی، معراج کرانے کی کیا ضرورت تھی، دنیا بنانے ہی کی کیا ضرورت تھی وغیرہ۔

کیا بلا واسطہ جبرئیل وحی نہیں آسکتی تھی، فرشتہ کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ ہر بندے سے براہ راست مخاطبت نہیں کرسکتا، بعثت انبیا کی کیا ضرورت تھی، ابن تیمیہ بڑے شخص تھے اور ماضی میں جتنے بھی امام گزرے ہیں، باطل ہر کسی کو نہیں کہا جاسکتا، دلائل سب ہی کے پاس ہیں، سوال صرف ترجیح کا رہ جاتا ہے اور قابل ترجیح مسلک متکلمین کا ہے۔ والسلام

عبدالماجد

جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں میں نے ایک خط بھیجا، جس میں بیک وقت مختلف قسم کے علمی وادبی سوالات تھے لیکن مولانا نہ اس سے بدظن ہوئے اور نہ خفگی کا اظہار کیا بلکہ پورے صبر وتحمل کے ساتھ میرے ہر سوال کا جواب نہایت تشفی بخش انداز میں دیا جواب آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

بسم اللہ

دریاباد

۱۳؍جنوری ۶۴ء وعلیکم السلام

ظاہر ہے کہ عربی میں نسلاً بعد نسلٍ ہی صحیح ہے۔ لیکن فصحائے اردو اگر نسلاً بعد نسلاً کہنا اور لکھنا شروع کردیں تو اردو میں وہی صحیح بلکہ فصیح مان لیا جائے گا، ہر زبان میں مستند عرف اسی کے فصحاء کا قول وعمل ہوگا۔ نہ کہ اس زبان کا جس سے کوئی لفظ آیا ہے۔(۴)

یقیناً میں نے مولانا شبلی سے کسب فیض کیا ہے۔ اور اپنی بساط بھر پوری طرح کیا ہے۔ ان کی کتابوں، مقالوں کو خوب پڑھا اور ان کے فقروں، ترکیبوں اور طرز انشا کی نقالی برسوں کی ہے۔

شاعری کی ہے مگر برائے نام، رنگ حسرت موہانی کا پسند تھا، مگر اصلاح کے لیے کلام حضرت اکبر الہ آبادی کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے صرف حوصلہ افزائی ہی کی بعد کو دوبار نعتیں غزلیں محمد علی جوہر کے رنگ میں کہیں۔

سید صاحب کا کوئی مجموعہ کلام مطبوعہ میرے علم میں نہیں۔(۵)

شرح دیوان حافظ کے لیے منیجر صدق بک ایجنسی لکھنؤ کو لکھنا بہتر ہوگا۔

سوچنے اور تلاش کرنے میں بڑا وقت لگے گا، برجستہ نام ولی اللہ ایبٹ آبادی کی ضخیم شرح دیوان حافظ یاد آتا ہے، نیز حضرت تھانوی کے قلم سے چند غزلوں کی حد تک عرفان حافظ کا، کوئی ترجمہ و شرح شاید قاضی محمد سجاد صاحب امام مسجد فتح پوری دہلی نے بھی لکھی ہے۔ والسلام عبدالماجد

دسمبر ۱۹۶۴ء کے اوائل میں ایک خط میں نے بھیجا جس میں کئی سوالات کے ساتھ ایک سوال مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے تعلقات پر تھا۔ مولانا دریابادی کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولانا آزاد کے مخلص دوستوں اور مداحوں میں تھے۔ جواب ملاحظہ کیجیے۔

بسم اللہ

دریاباد

۲۴/جنوری ۶۴ء وعلیکم السلام

عداوت بحمداللہ کسی ادنی مسلمان سے نہیں چہ جائیکہ مولانا مرحوم و مغفور سے۔ علمی وادبی مسائل میں اختلافات جو طلوع الہلال سے دو چار سال تک رہے۔ ۱۷ء میں بحمداللہ وہ بھی ختم ہوگئے۔ ۱۸ء میں مولانا نے جب وہ رانچی میں نظر بند تھے عذر معذرت ہی کر لی۔ اور ادھر سے بھی پورے انشراح خاطر کے ساتھ جواب آ گیا، یہ ساری خط و کتابت صدق میں بھی نکل چکی ہے اور لکھنؤ کے ماہنامہ نیا دور میں بھی۔ آخر تک تعلقات اچھے ہی رہے، ذاتی معاملات میں بحمداللہ سالہا سال سے خاموش ہی رہنے کا ہے، جس کا جو جی چاہے لکھے اور اخبار (۶) مذکور تو برسوں سے لکھ رہا ہے، یوم الحساب کچھ ایسا دور تو نہیں۔

دینی حالت ندوہ کی جامعہ سے کہیں بہتر ہے۔ دوسری چیزوں کا اندازہ خود کر لیا جائے۔ (۷)

سفر دہلی کی کبھی کوئی مخصوص و متعین غرض نہ تھی، مختلف دواعی و محرکات تھے۔ اجمالی ذکر سیر دہلی میں آ گیا ہے

میری کسی کتاب کی فروخت و اشاعت کا تعلق مجھ سے نہیں، منیجر صدق ایجنسی لکھنؤ سے رہتا ہے۔ خط تو جو بھی ہیں سب نجی ہیں۔ غیر نجی کوئی خط نہیں۔

کچھ اپنے حالات لکھ دیئے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ اشاعت بھی فوراً ہو جائے۔(۸)

غالباً ۲۵ء میں مولانا کی وفات پر جو مضمون لکھا تھا اس میں ضرور اسی کا ذکر ہوگا۔(۹)

والسلام　　عبدالماجد

ایک خط میں کئی علمی سوالات تھے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ چند معیاری انگریزی کتابوں کے نام لکھ دیے جائیں، تاکہ میں ان کا مطالعہ کرسکوں۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ احمقانہ سوال تھا۔ جو زمانہ طالب علمی میں کر بیٹھا۔ لیکن مولانا پر اس کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا اور نہ انہوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا، ہاں بس اتنا لکھ دیا کہ اظہار حقیقت ہو گیا۔ جواب ملاحظہ ہو۔

بسم اللہ

وعلیکم السلام

سفر میں ہوں، جواب وہیں سے دے رہا ہوں۔

مہدی افادی کے خطوط تو مدت ہوئی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد یہ اشتباہ کیوں کر ہو۔ یہ مہدی (برادر شبلی) ایک گمنام شخص تھے۔

اتنے دنوں بعد یہ تفصیلات کیا یاد رہ سکتی ہیں، ترجمہ زیادہ تر مقالات کے لیے تھے انسائیکلو پیڈیا وغیرہ سے، شاید ایک آدھ چھوٹی سی کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہو یہ تعلق تو صرف چند ماہ رہا تھا۔(۱۰)

بعض سوالات بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ انگریزی دنیا وسیع ترین زبانوں میں ہے۔ اس کے اعلا لٹریچر کی کتابیں کیا کوئی دس بیس ہو سکتی ہیں یا ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور پھر مجھ سے چند کتابوں کے نام ہی طلب کرنا مجھ پر ظلم ہے، انسان ہوں کوئی مشین نہیں ہوں، کتابوں کے نام مصنّفین کے نام یاد کرکے لکھنا سب پورے وقت کے طالب ہیں۔

جماعت کی ممبری کا مشورہ میں کسی کو نہیں دیتا، ممبر کو بہر حال پابند ہو جانا پڑتا ہے، عام ہمدردی رکھنے اور ان کی کتابوں اور رسالوں کو پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔(۱۱)

عبدالماجد

میں نے مارچ ۱۹۶۵ء کے اوائل میں ایک خط لکھا جس میں اخبار چٹان لاہور کے حوالے

سے سوال کیا کہ کیا آپ نے حال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہی ہے، جیسا کہ شورش کاشمیری نے الزام لگایا ہے۔ مولانا دریابادی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

بسم اللہ

دریاباد

۱۱/مارچ ۶۵ء عزیزم

وعلیکم السلام

مجھے بالکل یادنہیں پڑرہا ہے کہ میں نے مولانا ابوالکلام مرحوم ومغفور کے لیے یہ الفاظ کہیں کہے ہوں اور اس کا یقین بھی نہیں آرہا ہے۔ اس لیے کہ یہ میرے مسلک وعقیدہ کے خلاف ہے۔ میں تو ہر ادنی سے ادنی کا کلمہ گو کے حق میں دعائے رحمت ومغفرت کا عادی ہوں، چہ جائیکہ مولانا کی سی جلیل القدر اور باعث فخر کے لیے، لفظی لحاظ سے تو یہ بے شک صحیح ہے کہ بجز انبیائے کرام اور عشرہ مبشرہ کے اور کسی کی مغفوریت یقینی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ لیکن بہرحال عملاً ہم ہر کلمہ گو کو بہ لحاظ حسن ظن واغلبیت جنتی ہی لکھتے ہیں۔ چہ جائیکہ ان کو جو خدمت علم ودین میں اتنے ممتاز ہوں، اگر کہیں میں نے وہ الفاظ کہے بھی ہوں تو واللہ اعلم کس سیاق میں اور کس سوال کے جواب میں اور اب مولانا کی روح سے معذرت کے ساتھ باتیں بصد ندامت وتاسف واپس لیتا ہوں اور آں عزیز کو اختیار دیتا ہوں کہ میری اس معذرت کو اس اخبار میں یا جہاں کہیں پسند ہو چھپوائیں۔ صدق میں بھی انشاءاللہ اس کی نقل شائع کردی جائے گی۔

والسلام عبدالماجد

جون ۱۹۶۵ء کے اوائل میں میں نے ایک خط لکھا جس میں مختلف قسم کے سوالات تھے، مولانا نے سبھی سوالات کے جواب دیے۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے اس جواب میں اپنا مسلک و نظریہ تحریر فرمایا ہے۔ وہ بڑا اہم ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ان کے ذہن ودماغ میں جو بات صحیح سمجھ میں آجاتی ہے اسے وہ بلاکم وکاست کسی کی پرواہ کیے بغیر لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں چاہے کسی کو برا لگے چاہے کسی کو اچھا۔ کیونکہ علمی دیانت داری کا تقاضہ یہی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے قادیانیت پر میرے سوال کا جواب بھرپور انداز میں دیا ہے جو

حاضر خدمت ہے۔

بسم اللہ

دریاباد

۱۵؍جون ۶۵ء عزیزم وعلیکم السلام

جو مسئلہ جس طرح اپنی سمجھ میں آتا ہے بیان کر دیتا ہوں اور اس خبط میں بحمد اللہ کبھی نہیں پڑتا کہ اس کے موافق کتنے ہوں گے اور مخالف کتنے۔ اور نہ اپنے کسی مخلص سے اس پر خوش ہوتا ہوں کہ اس نے بجائے اپنی اصلاح حال کی فکر کے اس تحقیق میں پڑا ہے کہ فلاں ادارے میں مردم شماری میرے موافق کتنی ہے اور مخالفوں کی کتنی دیوبند ہوا، علی گڑھ ہوا، ندوہ ہوا بالکل ظاہر ہے کہ سب کہیں موافق بھی بہت ہوں گے اور مخالف بھی بہت سے۔

بحث و مناظرہ سے بات بگڑتی ہی جاتی ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات کی پیچ آپڑتی ہے۔

قل کل یعمل علی شاکلته۔

اب سوالات کے جواب دیتا ہوں، مگر کسی بحث میں پڑنے کے لیے ہرگز نہیں۔ بلکہ محض ایک مخلص کے علم و واقفیت کے لیے۔ حیرت اس پر ہے کہ ان سوالات کی ضرورت ہی کیا پیش آئی، جبکہ صدق میں بارہا ان پر گفتگو آچکی ہے۔

ا۔ میں قادیانیت سے نہیں احمدیہ سے واقف ہوں، جس طرح روافضہ سے نہیں، اشعریہ و امامیہ سے، دیانندیوں سے نہیں آریہ سماجیوں سے اور وہابیوں سے نہیں اہل حدیث سے واقف ہوں، معمولی تہذیب و شائستگی کا تقاضا ہے کہ ہر فرقہ کا نام وہی لیا جائے جو خود اس نے اپنا رکھا ہے نہ کہ وہ جو اس کے مخالفوں نے اسے مطعون کرنے کے لیے چلا دیا ہو۔

۲۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ تکفیر احمدیہ پر کہیں اجماع (بہ اصلاح شریعت) منعقد ہو چکا ہو، رہی علمائے عصر کی اکثریت اور غالب اکثریت، تو وہ وہی اکثریت ہے جو سرسید کے کافر ہونے پر، غیر مقلدین کے گمراہ ہونے پر اور شیعیت کا فر ہونے پر اتفاق کر چکی ہے۔

۳۔ میں نے احمدیہ لٹریچر اچھا خاصہ پڑھا ہے (اردو میں بھی انگریزی میں بھی) اتنا علما

میں سے کم ہی کسی نے پڑھا ہوگا۔اس میں بہت باتیں معقول وقابل قدر ہیں اور بہت سی قابل اعتراض ہیں۔تکفیر کسی ایک عقیدے سے ہی لازم نہیں آتی ختم نبوت کے منکر ہرگز نہیں۔البتہ اس کی تاویل ایسی کی ہے جو عقیدہ جمہور سے الگ ہے۔یہ تاویل صحیح نہیں لیکن لغت میں گنجائش اس کی بھی موجود ہے،اس لیے بنائے تکفیر نہیں بن سکتی،ہاں مخالف جمہور،مخالف اہل سنت وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔

۴۔اجر کا مستحق تو ہر خدمت دینی بنا دیتی ہے،جو اخلاص کے ساتھ انجام دی جائے۔

۵۔جب ماحول سے مناسبت نہ ہو اور اساتذہ کی کم استعدادی کا مضحکہ خیز حد تک تجربہ ہو چکے تو پھر اس ادارے میں مزید قیام میں مزید غور وفکر ونظر ثانی کا محتاج ہو جاتا ہے۔

اس خط میں پورا آدھا گھنٹہ لگ گیا۔اس لیے پہلے لکھ دیا تھا کہ حکیم عبدالقوی صاحب سے اگر ملاقات ہوتی رہے تو بہت سی باتوں کا جواب انہیں سے مل جائے اور میرا وقت بچ جائے۔آیندہ اتنا وقت دینے سے معذوری رہے گی۔ والسلام عبدالماجد

۱۹۶۶ء میں مولانا وحیدالدین خاں کے مشورہ سے میرا ارادہ ہوا کہ اب میں انگریزی تعلیم حاصل کروں گا۔جبکہ اس وقت تک میں انگریزی سے ناواقف تھا۔اس سلسلے میں میں نے اپنے مربی خاص مولانا عبدالماجد دریابادی سے مزید مشورہ طلب کیا۔مولانا نے میرے خط کا جواب دیا اور اپنے تجربات کی روشنی میں ایسی باتیں کہیں جو میرے لیے سنگ میل ثابت ہوئیں۔جواب ملاحظہ کیجیے۔

بسم اللہ

دریاباد

عزیزم وعلیکم السلام

تجویز ہے بہت اعلیٰ۔بن پڑے تو اس کا کیا کہنا لیکن ساتھ ہی دشواریوں اور خطرات سے لبریز بھی ہے۔دودھاری تلوار ہے۔خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے (۱۲)۔بہتر ہے کہ دو تین دنوں میں کر لیا جائے۔

لکھنؤ میں قیام انشاءاللہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ایک عرصہ کے لیے رہے گا۔اکثر شامیں مصروف رہیں گی پھر بھی کسی نہ کسی شام کو وقت نکال ہی لوں گا۔(۱۳)

تفصیل حکیم عبدالقوی سے دریافت ہو سکے گی۔ والسلام دعا گو و دعا جو
عبدالماجد

---

(۱) میں نے ذوالقرنین کی تعیین شخصیت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔(۲) مولانا کی تصنیف فلسفۂ اجتماع کے بارے میں دریافت کیا تھا کیا وہ آپ کی تصنیف سے خارج ہے۔ کیونکہ اس میں عقائد کے لحاظ سے بعض غلط باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ (۳) دریافت کیا گیا تھا کہ آپ دینی لحاظ سے اپنی کس تصنیف کو کیا درجہ دیتے ہیں۔ یہ اس کا جواب ہے۔(۴) ان دنوں اردو کے معروف مزاحیہ نگار اور ادیب رشید احمد صدیقی کی کتاب ''آشفتہ بیانی میری'' میرے زیر مطالعہ تھی۔ جس میں انہوں نے کئی مقام پر نسلاً بعد نسلاً استعمال کیا ہے۔ اس لیے میں نے یہ سوال مولانا دریابادی سے کیا تھا۔(۵) اس سے مراد مولانا سید سلیمان ندوی کا مجموعہ کلام ہے جو اس وقت تک نہیں چھپا تھا لیکن بعد میں ارمغان سلیمان کے نام سے پاکستان سے شائع ہو گیا۔(۶) اس سے مراد اخبار چٹان ہے جو شورش کاشمیری کی ادارت میں لاہور سے نکلتا تھا۔ شورش کاشمیری اس اخبار میں مستقل طور پر مولانا دریابادی کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ وہ مولانا آزاد اور مولانا دریابادی کے مابین اختلافات کو بغض وعناد اور دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ جبکہ مولانا دریابادی اس کی صفائی پیش کرتے رہتے تھے۔(۷) میں دیوبند سے فراغت کے بعد ندوہ یا جامعہ جانا چاہتا تھا، اس لیے ان دونوں کے دینی ماحول کے سلسلے میں دریافت کیا تھا۔(۸) میں نے مولانا کی سوانح عمری کے بارے میں پوچھا تھا، یہ گرچہ اس وقت تک نہیں چھپی تھی لیکن بعد میں آپ بیتی کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔(۹) اب یاد نہیں پڑتا کہ کس سلسلے میں یہ سوال کیا تھا۔(۱۰) میں نے دارالترجمہ حیدرآباد میں مولانا دریابادی کی ترجمہ نگاری کے بارے میں سوال کیا تھا کہ انہوں نے وہاں کتنے دن اور کیا کیا خدمات دی تھیں۔(۱۱) یہاں جماعت اسلامی مراد ہے۔ میں زمانہ طالب علمی سے آج تک اس کے ہمدردوں میں ہوں اور اسلامی لٹریچر سے فیض یاب ہوتا رہتا ہوں۔(۱۲) مولانا کا جواب آنے کے بعد میں نے انگریزی تعلیم شروع کر دی۔ ۱۹۷۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا، جس میں تاریخ ہند، انگریزی اور عربی سبجیکٹ تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۷۲ء میں ایم اے (عربی) کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس طویل سفر میں بلاشبہہ ہر جگہ خطرات ہی خطرات تھے لیکن اللہ تعالیٰ کا میرے ساتھ خاص فضل وکرم رہا ہے، اس دوران نہ میرا قدم کہیں لڑکھڑایا اور نہ دینی لحاظ سے کہیں کوئی لغزش ہوئی۔ اس نے برخلاف میں نے اپنے بعض احباب فارغین کو دیکھا کہ وہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے یا بے دینی کے شکار ہو گئے۔ مولانا نے صحیح فرمایا تھا کہ یہ تعلیم دودھاری تلوار ہے۔(۱۳) میری خوش بختی تھی کہ مولانا نے اپنے زمانہ قیام لکھنؤ میں دو تین شام خود ہی میرے لیے مخصوص فرما دیں، جن میں ان سے میری بالمشافہ ملاقاتیں رہیں۔ عصر بعد تا مغرب ان کی بابرکت صحبت میں میں بیٹھ کر ان کی علمی وادبی موشگافیوں سے فیض یاب ہوا، میں نے یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کی تو ان کی ان مجالس میں صرف علمی وادبی موضوعات پر باتیں ہوتی تھیں۔ دو تین بار ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، مولانا احوال دریافت کرتے، حالات سن کر خوش ہوتے اور دعائیں دیتے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

اقبال کا تصور ملوکیت

ڈاکٹر شبنم اسد

شاعری ہو یا نثر، ادب کی یہ دونوں اصناف انسانی شخصیت کے پردوں کو چاک کرتی ہیں۔ افکار اور خیالات کے توسط سے نہ صرف انسانی جذبات آشکار ہوتے ہیں بلکہ ایک شاعر اور ادیب کے علمی اور ادبی قد کا ادراک کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری زندگی کے تمام تر موضوعات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعر مشرق کے افکار کے ہر پہلو کی توضیح و تشریح کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن ملوکیت کے بارے میں اقبال نے جو نظریہ اختیار کیا ہے وہ کوئی مبہم اور پیچیدہ نظریہ نہیں ہے۔ صاف ہے کہ اقبال ملوکیت کو پسند نہیں کرتے تھے اور اسے انسانیت کے لیے بہت ہی نقصان دہ مانتے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں اپنی شاعری اور خطبات میں واضح انداز اختیار کرنے کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کی شاعری فلسفیانہ مزاج کی حامل ہونے کے باوجود اسلام کے تبلیغی انداز سے عبارت ہے۔ اقبال نے مختلف لوگوں یا سماج کے طبقوں خاص کر نوجوانوں سے جب بھی خطاب کیا ہے اس میں اسلام کے بنیادی نظریات کی تعلیم دی ہے۔ اس طرح کے نظریات میں ملوکیت کے خلاف جنگ اور جمہوری خلافت کی بحالی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں مذہب کو اقتدار سے الگ کرکے لادینی جمہوریت کا غلبہ ہو چکا تھا۔ جدید مغربی نظریات نے یورپ کے ساتھ ساتھ ایشیا کے بیشتر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مسلم ممالک جیسے ترکی، مصر، ملیشیا وغیرہ۔ ان نظریات کو اختیار کرنے میں پیش پیش تھے۔ چند عرب ملکوں میں ملوکیت ایک طویل عرصے سے ضرور حکومت کرنے کا روایتی ذریعہ تھی۔ ایسے حالات میں مغربی جمہوریت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرنا اور جمہوری خلافت کی بات کرنا بہت ہی عجیب لگتا تھا، لیکن اقبال نے وہی کیا جو کرنا

جموں کشمیر۔ shabnumassadnaik@gmail.com

چاہیے تھا یعنی انہوں نے ملوکیت کو اسلام کا حصہ اس لیے ماننے سے انکار کر دیا کہ اس سے قوموں اور ملکوں میں عقل کے فساد کا خطرہ ہے۔ تیموری ہو یا چنگیزی، یہ طرز حکومت انسانوں کے لیے تباہ کن ہیں۔ اس میں حاکم و محکوم کی تمیز مٹ ہی نہیں سکتی، کوئی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ گداگر بھی شاہ کا ہمدوش ہو سکتا ہے۔

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز
تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی
مجال کیا کہ گداگر ہو شاہ کا ہمدوش(۱)

عرب کے مقدس مقامات خاص کر حرم پاک اور گنبد خضراء کے ساتھ انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود انہوں نے ان ملکوں کی حکومتوں کو اپنی ریزہ کار طبیعت کے تحت یہی سمجھا کہ

ع ہوائے بزم سلاطیں، دلیل مردہ دلی

ان بادشاہوں کو دیکھ کر وہ کہہ اٹھتے کہ ان کو رہ و رسم شاہبازی سے کیا نسبت، ان کو مغرب کا جمہوری نظام بھی ایسا ساز کہن لگتا تھا جس کے پردوں میں بس نوائے قیصری ہی تھی۔ نام نہاد مغربی جمہوریت جس نے پوری دنیا کو طلسم سامری کا اسیر کر لیا، اس کی حقیقت کو اقبال نے جس طرح فاش کیا وہ اقبال کی غیر معمولی نظر کی شاہد ہے، یہ اشعار شاید ہی جمہوریت کے باب میں کسی بھی زبان کے شعری رویوں میں ملتے ہوں کہ:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجلس الاماں یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اسی لیے اقبال کو ایسا نظام حکومت منظور نہیں ہے جس کا سربراہ ظل الٰہی ہونے کا دعویٰ کرے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے(۲)

درحقیقت علامہ اقبال ایک انقلابی شاعر تھے۔انہوں نے جمود کی سخت مخالفت کی ہے اور جمود کو زندگی کے لیے سم قاتل قرار دیا ہے۔جبکہ ملوکیت ایک جمودی شہنشاہی نظام کی کڑی ہے۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اقبال خالی خولی انقلاب پسند نہیں کرتے تھے۔انہوں نے اس انقلاب کی مخالفت کی ہے جو ایک استحصالی گروہ کو ہٹا کر دوسرے استحصالی گروہ کو اقتدار پر لائے۔ایک ظالم کو ہٹا کر اقتدار دوسرے ظالم کے حوالے کرنے کے وہ حامی نہ تھے۔ بلکہ وہ صالح انقلاب کے وکیل اور داعی تھے۔ اقبال صداقت،شجاعت اور عدالت کا نظام قائم کرنے کے حق میں تھے نہ کہ سلطانی،ملائی اور پیری۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری(۳)

اقبال مسلمانوں کے زوال کے لیے جن اسباب کو بیان کرتے ہیں ان میں ملوکیت سرفہرست ہے۔اقبال اسلامی حکومت جو بنی امیہ سے عثمانیوں تک قائم تھی،اس کو وہ دورگراں خوابی سے تعبیر کرتے ہیں،نظم''طلوع اسلام''میں خلافت عثمانیہ کی بربادی کو کوہ غم ٹوٹنے سے تعبیر کیا لیکن اس غم میں بھی ان کی رجائیت یقین دلاتی ہے کہ سحر تو پیدا ہی ہوتی ہے خون صد ہزار انجم کی سرخی سے۔اقبال مسلمان ممالک کو ملوکیت کے جبر و استبداد سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے صداقت،عدالت اور شجاعت کا سبق یاد دلاتے تھے۔ان کے کلام کا بڑا حصہ لادینی سیاست کی نفی اور بے رحم اور خودغرض ملوکیت کے خلاف بغاوت ہے۔علامہ اقبال کے مجموعے''ضرب کلیم''جس کے بارے میں انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ یہ کتاب دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ ہے،اصل میں دور حاضر کے اسی ملوکی نظام کے خلاف ہے جس کو مغرب نے لادین سیاست کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔

اقبال ملوکیت کے نظام کو اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں بادشاہی کے اس نظام سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔اپنے ایک مضمون''خلافت اسلامیہ''میں جو انہوں نے ۱۹۰۸ء میں لندن کے جریدے سائیکالوجیکل ریویو (Pyschological Review) میں لکھا تھا۔ کہتے ہیں:

''پیغمبر عربؐ نے عرب کی اس قدیم رسم (یعنی سردار قبیلے کے انتخاب کے طریقے) کو قائم رکھا ہے۔رحلت کے وقت یا اس سے قبل اپنی جانشینی کے متعلق مسلمانوں کو ہدایات

نہ فرمائیں....یہی وجہ تھی کہ خانہ جنگی کے خطرے سے بچنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب فوراً ہوا...حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ نے رحلت سے قبل اپنے جانشین کی نامزدگی کا اہم کام سات انتخاب کنندگان کے سپرد کیا۔ان سات میں آپؓ کے اپنے فرزند بھی شامل تھے....(لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو خلافت کی امیدواری سے روک دیا تھا)...حضرت عمرؓ کا خود اپنے فرزند کو خلافت کی امیدواری سے مستثنیٰ رکھنا کس قدر روشن اور جلی ثبوت ہے اس الم نشرح حقیقت کا کہ اس زمانے تک عرب کے سیاسی دل و دماغ کو روایتی بادشاہت کے خیال سے قطعاً بعد اور مغایرت تھی"۔(۴)

عرب کے لوگ دور جاہلیت میں دائرہ کی شکل میں بیٹھ کر مشورے سے اپنے سردار کا انتخاب کرتے تھے۔ان باتوں پر غور کرتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام ابتداء ہی میں اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ عملاً سیاسی حکومت جمہوری ہے نہ کہ کوئی خاص فرد واحد اس کا مستحق ہے۔اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ ختم نبوت کے تصور کے مختلف پہلوؤں میں سے اسلام میں بادشاہت کا خاتمہ ایک پہلو ہے اور اسلام کی روح ملوکیت نہیں بلکہ جمہوریت ہے۔یہی وجہ تھی کہ اقبال جمال الدین افغانی کے اس خیال کو درست مانتے تھے کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام میں ملوکیت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ خلافت کیوں ملوکیت میں تبدیل ہوئی،اپنے مضمون "خلافت اسلامیہ" میں اقبال نے اس کے دو بڑے سبب بتائے ہیں۔پہلا ایرانیوں اور منگولوں کا انتخاب سے نا آشنا ہونا بلکہ اس کا مخالف ہونا،جبکہ یہی وہ دو بڑی قومیں تھی جنھوں نے اسلام کو بحیثیت مذہب قبول کیا تھا۔دوسرا یہ کہ مسلمانوں نے زیادہ تر فتوحات کی طرح توجہ دی،اور حکومت صرف کچھ افراد کے ہاتھ میں رہی اور جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ ملوکیت نے جنم لیا،جس کے خلاف "اسرار و رموز" اور "جاوید نامہ" میں اقبال نے اپنے خیالات زیادہ واضح انداز میں پیش کیے۔

در دعائے نصرت آمین تیغ او
قاطع نسل سلاطین تیغ او(۵)

اقبال ملوکیت کی جڑیں اکھاڑنے کے خواہش مند ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ملوکیت کو ازروئے اسلام حرام قرار دیا ہے۔ملوک یعنی بادشاہ نہ صرف یہ کہ دھوکے اور فریب سے لوگوں پر حکومت

کر کے ان کا استحصال کرتے ہیں بلکہ اپنی طاقت و دولت کے زور پر انہیں غلامی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اقبال نے ملوکیت کی غلامی سے اس فقر کی غلامی کو پسند کیا ہے جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے۔

غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است(۶)

ملوک اور امرا اپنی طاقت و دولت سے ہم درد اور دوست خریدتے ہیں، عوام کا خون چوس کر اپنی عیاشیوں کے سامان پیدا کرتے ہیں۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں ملوکیت پر تنقید کرتے ہوئے اسے ایک ایسی شہد کی مکھی قرار دیا ہے جو پھول سے رس نچوڑ کر لے جاتی ہے اور اگرچہ پھول کی ظاہری شکل و صورت برقرار رہتی ہے مگر اس کی مٹھاس ختم ہو جاتی ہے۔

دنیا میں سامراجی دور اور پھر مغربی جمہوریت کے تحت اگر حکمرانوں کے طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو سامراجیت، مغربی جمہوریت اور ملوکیت کی سرحدیں باہم ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کوئی بھی دور رہا ہو ملوکیت کے جملہ خواص حکمران طبقے کے فکر و عمل میں نمایاں رہے ہیں۔ انھوں نے بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ ہر دور میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے برسر اقتدار آ کر ملوکیت کی پیروی میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر عوام کے حقوق کو پامال کیا ہے۔ عوام ایک طرف معاش کی چکی میں پس رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی دولت لوٹ کر غیر ممالک بینکوں میں بھی منتقل کی جاتی ہے۔ غرض کہ چند خاندان پھلتے پھولتے ہیں اور عوام زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے ملوکیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہی اب مغربی جمہوریت پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ جمہوریت کے جس طرز کو ہم نے اپنایا ہے وہ بھی ملوکیت ہی کے بطن سے پیدا شدہ ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ملوکیت سے متعلق یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینۂ بے نورِ اُو از دل تہی است
مثل زنبورے کہ برگل می چرد
برگ را بگداز و شہدش می برد(۷)

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ اٹلی کے فاشسٹ مسولینی سے متعلق اقبال کی نظم

سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ مسولینی کی فاشیسیت کے حق میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے کہیں اس کی حمایت نہیں کی، اگر مسولینی سے متعلق اقبال کی نظم کے مصرعوں کو غور سے پڑھا جائے تو یہ مسولینی کی حمایت میں نہیں بلکہ مسولینی کی زبان سے مغربی استعمار کی مذمت ہے۔ مسولینی نے مغربی استعمار کو آئینہ دکھایا ہے کہ جس فاشیسیت پر آج وہ ماتم کر رہا ہے اس کا راستہ ان ہی کا دکھایا ہوا ہے۔ ایک غزل کا آخری شعر مسولینی کی فاشیسیت سے متعلق اقبال کے مسلک کا کھل کر اظہار کر رہا ہے۔

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج (۸)

مسولینی کی فاشیسیت کو اقبال نے غارت گری اور آدم کشی کہا ہے، بلکہ خود مسولینی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی مسولینی نے ابی سینیا پر حملہ کر رکھا تھا۔ اس صورت میں اقبال جیسا شخص مسولینی کی حمایت بھی کیسے کر سکتا تھا؟ اقبال نے تو ان مسلمانوں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے، جنھوں نے اسلامی تعلیمات کے برعکس ملوکانہ طرز حکومت کا چلن اختیار کیا:

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است　　رسم و آئینِ مسلمان دیگر است
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشت
تا نہال سلطنت قوت گرفت　　دین اُو نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر　　عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر (۹)

"اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک مکتوب میں مسلمانوں کی کشور کشائیوں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے:

"مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں، لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداً اسلام کے حقیقی مقاصد میں داخل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی، میرے نزدیک وہ اسلام کے مقاصد

> کے حق میں بے حد نقصان دہ تھی۔اس طرح وہ جمہوری اور اقتصادی اصول نشوونما نہ پاسکے جن کا ذکر قرآن کریم اور احادث نبویؐ میں جابجا آیا ہے۔ بیشک مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت تو قائم کرلی،لیکن ساتھ ہی ان کے نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا"۔(۱۰)

اقبال نے جو سیاسی نظام قائم کیا ہے اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ زمین کسی شخص، کسی خاندان اور کسی قوم کی ملک نہیں ہے، بلکہ دنیا میں جو کچھ ہے سب خدا کا ہے لیکن آج تک دنیا نے ملوکیت کے ذریعہ سے خدا کی زمین پر قبضہ غاصبانہ کرکے اس کو اپنی موروثی جائیداد بنالیا ہے۔اقبال کا ماننا ہے کہ ملوکیت کا یہ سیاسی نظام ابلیس کا قائم کیا ہوا ہے، جس پر ابلیس کو نہایت فخر ہے اور ابلیسی نظام سیاست نے ایک طرف تو مسجد، دیر اور کلیسا کا افسوں توڑکر سلطنت مذہب اور اخلاق سے بالکل بیگانہ کردیا، دوسری طرف غلامی کے خمیر کو اور بھی زیادہ پختہ کردیا ہے۔اس لیے ابلیسی نظام کو توڑنے کے لیے سب سے پہلے آزادی کی ضرورت ہے اور اقبال اصولاً آزادی کے سب سے بڑے حامی ہیں۔اقبال کا ماننا ہے کہ جن ملکوں میں ملوکیت کی حکمرانی رہی، وہاں بزدل اور کم ہمت اقوام نے جنم لیا۔لیکن بایں ہمہ وہ موجودہ دور کی آزادی کو بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھتے۔

حوالہ جات

(۱) محمد اقبال،کلیات اقبال اردو، (دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء) ص ۴۵۴۔ (۲) ایضاً، ص ۵۷۵۔ (۳) ایضاً، ص ۸۴۴۔ (۴) محمد اقبال، خلافت اسلامیہ، مترجم، چودھری محمد حسین (لاہور، ظفر برادرس تاجران کتب، ۱۹۲۳ء) ص ۳ تا ۶۔ (۵) محمد اقبال،کلیات اقبال فارسی، مترجم حمید اللہ ہاشمی (لاہور، مکتبہ دانیال) ص ۴۳۔ (۶) ایضاً، ص ۹۷۲۔ (۷) ایضاً، ص ۶۵۲۔ (۸) محمد اقبال،کلیات اقبال اردو (دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء) ص ۸۲۷۔ (۹) محمد اقبال،کلیات اقبال فارسی، مترجم حمید اللہ ہاشمی، (لاہور، مکتبہ دانیال) ص ۶۶۶، ۶۶۷۔ (۱۰) ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء، (لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۸ء) ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

اخبار علمیہ

”کتب خانۂ مستقبل“

ناروے کے دارالحکومت اوسلو کے نورڈ ما کہ کے جنگلات میں سفیدے کے ہزاروں درخت اگائے جارہے ہیں جو آیندہ ۹۶ برسوں بعد ۲۱۱۴ میں کاٹے جائیں گے اور ان کو گودے کے مختلف مراحل سے گذار کر کاغذ بنایا جائے گا۔ پھر یہ کاغذات اسکاٹش آرٹسٹ کیٹی پیٹرسن کی فیوچر لائبریری یعنی کتب خانۂ مستقبل کو ان سو مصنّفین کی کتابوں کی اشاعت وطباعت کے لیے مہیا کیا جائے گا جن کی کتابیں ۲۱۱۴ء سے پہلے پڑھی نہیں جاسکتیں۔ یہ کتابیں اسکاٹ لینڈ کی کیٹی پیٹرسن جمع کررہی ہیں۔ فیوچر لائبریری کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی منتخب کردہ سو کتابوں میں ہر سال ایک کتاب شائع کی جائے گی۔ گویا یہ کتب خانۂ مستقبل عصر حاضر کے محافظین ادب کی طرف سے مستقبل کے قاریوں کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ بہت سے مشہور ناول نگاروں کی طرح ترکی کی مشہور ناول نگار الف شفق نے بھی اپنی چوتھی کتاب کا مسودہ جنگل میں منعقد ایک تقریب میں لائبریری کے حوالہ کیا ہے۔ مسودہ ایک خوبصورت ڈبّے میں مہر بند تھا۔ مسودہ لیتے وقت ٹرسٹ کے چیرمین ہونڈ نے شفق کو تنبیہ کی کہ اس کے بارے میں کسی سے بات نہ کی جائے۔ صرف کتاب کا نام بتانے کی اجازت ہے۔ چنانچہ شفق نے حاضرین کو اس کا ٹائٹل ”دی لاسٹ ٹیبو“ بتایا۔ ۲۰۲۰ء میں یہ مسودے اوسلو میں زیر تعمیر نیوڈ یچ مینسکے لائبریری میں رکھے جائیں گے۔ اس کمرے میں ایک سے دو فرد کو جانے کی اجازت ہوگی، جہاں شیشے کے شوکیس میں بند ان مسودوں کی جھلک دیکھی جاسکے گی جو منتظر اشاعت ہیں۔ واضح ہو کہ فیوچر لائبریری ۲۰۱۴ء میں اوسلو کی شہری حکومت کی جانب سے قائم کی گئی ہے۔ (انقلاب، وارانسی، ۱۲/نومبر ۲۰۱۸ء ص ۱۱)

”زمین پر ۴/ارب سال پہلے زندگی موجود تھی“

سائنسی تحقیقی جریدہ ”نیچر“ میں شائع تازہ ترین تحقیق کے مطابق ماہرین کو کناڈا میں خلیج ہڈسن کے علاقہ میں ایک سمندری معدنی چٹان سے ایسی مائیکروسکوپک ٹیوبیں اور حیاتی اجزا کی باقیات ملی ہیں جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ زمین پر کم از کم ۳/ارب ۷۷ کروڑ برس قبل بھی زندگی موجود تھی۔ رپورٹ کے مطابق یہ مائیکروفوسلز دراصل بیکٹیریا کی طرح کے ایک خلیاتی مائیکروبیس کی ایک انتہائی

قدیم باقیات ہیں جو اربوں سال گذر جانے کے نتیجہ میں اب معدنی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اب نامیاتی چٹانی شکل میں سمندر کی تہ میں پائی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کو اس سے قبل اربوں سال پرانے ایسے ٹھوس شواہد نہیں ملے تھے جو اپنی قدیم سے قدیم ترین حالت میں بھی زمین پر زندگی کس وقت موجود تھی، اس کا پتہ دیں۔ ۳ء۷۷ بلین سال پرانے مائیکروفوسلز ایسے بیکٹیریا کی وجہ سے بنے جو سمندر کی تہ میں ہائیڈروتھرمل خطوں میں لوہے کے مختلف ایٹموں پر گذارہ کرتے ہوئے زندہ رہتے تھے۔ ان کی موٹائی ایک عام انسانی بال سے بھی کم ہے۔ محققین کے مطابق یہ ۴ء۳ ارب سال تک پرانے ہو سکتے ہیں۔ اب تک قدیم ترین مائیکروفوسلز کے جو شواہد ملے تھے وہ ۳ء۴۶ بلین سال پرانے تھے۔ (احمد ٹائمز، حیدرآباد، اکتوبر ۲۰۱۸ء، ص ۳۲)

"ہوم اسسٹنس کی زبان فہمی میں وسعت"

اسمارٹ ہوم ڈیوائسز کو دنیا بھر میں پھیلانے کے منصوبہ پر اب ایمزون کمپنی نے کام تیز کر دیا ہے۔ یہ برقی آلات گھر کے معاون کے طور پر ترقی یافتہ ممالک اٹلی، اسپین، فرانس، جرمنی، جاپان وغیرہ میں بہت مقبول ہیں۔ آواز سے کام کرنے والے یہ آلات خبروں اور مضامین کے انتخاب کے ساتھ کھانا پکانے کی تراکیب کی مدد سے کھانا پکانے میں معاونت کرتے ہیں اور اب یہ گھر گھر کی ضرورت بنتے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے ہیں۔ عام گھر کو خاص گھر میں تبدیل کرنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ ایمزون نے اب تک اٹلی اور اسپین میں اپنے آلات کو فروخت کرنے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا اور ان ممالک کی زبانوں کے ساتھ مطابقت کا مرحلہ ابھی طے نہیں تھا مگر اب ان مذکورہ ممالک میں متعارف ہونے کے بعد اس کا تجارتی دائرہ مزید وسیع ہو گیا ہے۔ انگریزی، ہسپانوی، اطالین، جرمن اور جاپانی زبانوں میں ہدایات وصول کر کے یہ آلات ہوم اسسٹنٹ کے طور پر اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہے ہیں۔ اس وقت سب سے زیادہ زبانیں سیکھنے اور استعمال کرنے والے ہوم اسسٹنس کی تیاری میں ایپل سری کا نام سامنے آیا ہے جن میں تقریباً ۲۰ زبانیں سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ گوگل کمپنی کا ارادہ ہے کہ سال کے آخر تک وہ تیس زبانوں کو اس آلہ کی دست رس میں لائے گی۔ چین میں اس وقت بیڈو اور زیامی آلات صرف چینی زبان کو سمجھتے ہیں۔ (اخبار مشرق، سنڈے میگزین گلدستہ، ۱۱ نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۹)

''خلائی مخلوق کا انتباہ''

امریکی ریاست نیومیکسیکو کے ایک تحقیقی مرکز ''نیشنل سولر آبزرویٹری'' کی جانب سے خلا میں بھیجے گئے سگنلز یعنی پیغامات کے جواب میں آنے والے طاقتور سگنلز نے ماہرین کو خوف زدہ کردیا ہے اور یہ خدشات ظاہر کیے جارہے ہیں کہ خلائی مخلوق زمین کے اس خطے پر حملہ کرسکتی ہے یا اپنے جدید قسم کے ہتھیاروں کی مدد سے ارضیاتی مقناطیسی طوفان برپا کرسکتی ہے جس سے زمین کی سطح کا مقناطیسی میدان خاص مدت کے لیے اپنا توازن کھوسکتا ہے اور اس کی وجہ سے متعلقہ اہداف مکمل تباہ ہوسکتے ہیں۔ نیشنل سولر آبزرویٹری کے محققین کے مطابق تین ارب نوری سال کی مسافت پر موجود کئی کہکشاؤں سے ان کو خلائی مخلوق کی جانب سے یہ سگنلز موصول ہورہے ہیں۔ سائنسی محققین کا کہنا ہے کہ اس سے قبل ایسا ایک شمسی مقناطیسی طوفان ''جیومیگنیٹک اسٹارم'' ۱۹۸۹ء میں امریکی ریاست ٹیکساس میں بھی آیا تھا جس کے سبب بجلی کی ترسیل کے نیشنل گرڈ کو شدید نقصان پہنچا تھا اور ساٹھ لاکھ امریکی باشندوں کو نو گھنٹہ تک بجلی کے بغیر رہنا پڑا تھا۔ اس کے بعد ۱۴؍ جولائی ۲۰۰۰ء میں بھی ایک ارضیاتی مقناطیسی طوفان آیا لیکن خوش قسمتی سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس پُراسرار معاملہ کے بارے میں ایک دلچسپ رپورٹ روسی آن لائن جریدہ ٹائمز آف رشیا میں شائع ہوئی ہے جس میں دعوی کیا گیا ہے کہ نیومیکسیکو میں خلائی مخلوق کے حملوں کا خوف ہے اور امریکی حکومت نے شہریوں کو خلائی مخلوق کے حملوں سے بچانے کے لیے عام نقل وحرکت مسدود اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائی جانے والی ایف بی آئی سمیت اسپیشل فورسز کو تعینات اور فضا میں جدید طیاروں اور بلیک ہاک ہیلی کاپٹرز کی پرواز میں شروع کردی ہے لیکن وہ اس ضمن میں کچھ بتانے سے گریز کررہے ہیں۔ بہرحال فوری طور پر تحقیقی مرکز کو بند کردیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ آنجہانی سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ نے اپنے کم ازکم تین مقالوں میں خبردار کیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں خلائی مخلوق کو سگنل یا پیغام نہ بھیجیں کیونکہ پیغام سمجھنے میں غلطی یا پیغام کو حملوں کا انتباہی سگنل سمجھ کر خلائی مخلوق کی جانب سے زمین کو نشانہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ (منصف، حیدرآباد، ۱۵؍نومبر ۲۰۱۸ء،ص ۸)

ک،ص اصلاحی

تلخیص و ترجمہ

اسلامی تہذیب کی ترقی میں برصغیر کی مساعی

(صنعت طباعت اور فارسی کتب کی طباعت کے حوالے سے)

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ترجمہ: ڈاکٹر عصمت درانی *

زمانی اعتبار سے موجودہ فارسی ادب کی تاریخ تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے اور اس کی جغرافیائی حدود، بنگال سے بلقان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تاریخی لحاظ سے فارسی کے زیر اثر علاقوں کا ایک بڑا حصہ ''برصغیر'' پر مشتمل ہے جو آج تین الگ الگ خود مختار ممالک: پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ہزار سال سے فارسی زبان و ادب کی آبیاری، ترویج، حفاظت میں برصغیر کا حصہ، فارسی کے دیگر علاقوں جیسے فارس، خراسان، عثمانی خلافت اور ماوراء النہر سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ خصوصاً فارسی ادب میں برصغیر بعض ایسے امتیازات کا حامل ہے جو فارسی کے دیگر علاقوں کو نصیب نہیں ہوئے۔ مثلاً:

تصوف کی اولین فارسی کتاب اور اولیاء اللہ کا تذکرہ کشف المحجوب، علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) نے پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لاہور (پاکستان) میں لکھا۔

فارسی شعرا کا اولین تذکرہ لباب الالباب، جو آج بھی دستیاب ہے، سدید الدین محمد عوفی کی تالیف ہے۔ عوفی نے منگول حملوں سے جان بچانے کی غرض سے اپنے وطن بخارا کو ترک کر کے سندھ کا رخ کیا اور ناصر الدین قباچہ کے پاس چلے آئے۔ جو ۶۰۲ تا ۶۳۵ھ/ ۱۵۰۶ تا ۱۲۳۷ء ملتان اور سندھ کا حاکم تھا، اور وہاں یہ تذکرہ لکھا۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات کی تالیف کا آغاز بھی ناصر الدین قباچہ کی فرمائش پر ہوا جو تاریخی افادیت کی حامل فارسی ادب کی اہم ترین

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

کتاب شمار ہوتی ہے۔(۱)

قدیم ترین فارسی فرہنگ لغت فرس اسدی طوسی (وفات: ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۳ء) ایران میں تالیف ہوئی۔لیکن دوسری قدیم ترین لغت فرہنگ قواس ہے جو فخر الدین مبارک قواس غزنوی نے علاء الدین محمد خلجی کے عہد (۶۹۵۔۷۱۵ھ/ ۱۲۹۵۔۱۳۱۵ء) میں برصغیر میں لکھی۔فخر قواس کو برصغیر میں فارسی لغت نویسی کا بانی کہا جاتا ہے۔بعد میں لکھی جانے والی لغات،فرہنگ قواس ہی کے زیر اثر تالیف وتیار ہوئی ہیں۔(۲)

فارسی کے متقدم ترین شعرا کی جب فہرست تیار ہوتی ہے تو اس میں غزنوی حکومت پنجاب (۳۵۱۔۵۸۲ھ/ ۹۶۲۔۱۱۸۶ء) میں لاہور کے شعرا نکتی، ابوالفرج رونی،مسعود سعد سلمان، یوسف دربندی اور مسعود شالی کوب کا نام بھی شامل ہوتا ہے۔

لسانیات اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ کے ضمن میں سراج الدین علی خان آرزو (۱۰۹۹۔۱۱۶۹ھ/ ۱۶۸۸۔۱۷۵۶ء) کی تالیف مثمر،فارسی اور سنسکرت کے باہمی رشتوں پر لکھی جانے والی واحد فارسی کتاب ہے جو برصغیر میں لکھی گئی۔یہ کتاب جلال الدین سیوطی (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء) کی عربی تصنیف المزھر کی طرز پر ہے۔(۳)

فارسی زبان کے قواعد کی اولین کتاب اصول فارسی عبدالصمد زندہ طاہر ملتانی نے ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء میں برصغیر میں تالیف کی۔ایران میں اس کے ڈیڑھ سو سال بعد فارسی زبان کی قواعد نویسی کا آغاز میرزا حبیب اصفہانی (۱۲۵۰۔۱۳۱۱ھ/ ۱۸۳۵۔۱۸۹۴ء) نے کیا۔

اگر ہم اصناف اور علوم وفنون کی اساس پر کتب کی تصنیف میں برصغیر کے حصہ کا جائزہ لیں، تو دیکھتے ہیں کہ بہت سے علوم میں جس قدر کام برصغیر میں ہوا ہے، فارسی کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہوا۔مثلاً:

اولیائے کرام کا آخری اہم ترین تذکرہ، جو فارسی زبان میں ایران میں تالیف ہوا،مولانا نورالدین عبدالرحمان جامی (۸۱۷۔۸۹۸ھ/ ۱۴۱۴۔۱۴۹۲ء) کا نفحات الانس (تاریخ تالیف: ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۸ء) ہے۔اس کے بعد ایران میں صرف ایک اہم تذکرہ طرایق الحقایق لکھا گیا جو معصوم علی شاہ نعمت اللّٰہی شیرازی (۱۲۷۰۔۱۳۴۴ھ/ ۱۸۵۳۔۱۹۲۵ء) کی تصنیف ہے۔لیکن ان چار صدیوں کے دوران

برصغیر میں تذکرہ نویسی کے کام میں کبھی تعطل نہیں آیا اور صوفیہ کے سینکڑوں تذکرے لکھے گئے۔

برصغیر میں قدیم فارسی متون کی شرح نویسی کی روایت شاندار رہی ہے۔ ہر موضوع پر کتابوں کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اگر صرف ادبیات کو لیا جائے تو مثنوی مولانا روم، شیخ سعدی کی گلستان و بوستان، دیوان حافظ شیرازی، جامی کی یوسف و زلیخا اور نظامی گنجوی کے سکندرنامہ پر برصغیر میں ایک ابتدائی تخمینے کے مطابق تقریباً پچاس فارسی شروح لکھی گئی ہیں۔(۴)

ادبی و شعری تنقید کے میدان میں بھی برصغیر کے ادیب، اہل ایران سے آگے ہی رہے ہیں۔ اس کا اعتراف خود انصاف پسند ایرانی نقاد و محقق بھی کرتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کوکنی کا یہ بیان:

> ''ہندوستان کے فارسی ادیبوں کا حلقہ، ہماری قومی زبان (فارسی) کے فروغ کی راہ میں ایثار اور جاں نثاری کی حد تک کوشاں ہے، یہ لوگ خود اس عظیم تہذیب اور وسیع ادب کے عظیم حصہ دار ہیں، (شیخ علی) حزین کی وفات (۱۷۶۶ء) کے بعد گذرنے والے ڈھائی سو سالوں میں ہندوستانی ادیبوں نے فارسی زبان میں تنقید کے شعبہ کو ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ اگر دسویں صدی ہجری تک فارسی زبان کے دیگر ادیبوں کی تحریروں میں تفکر اور تنقیدی نظریات کم زور اور کم مایہ رہے ہیں، تو ان دو صدیوں میں ہندوستان کے ادیب، فارسی شاعری کے عظیم ترین نقاد رہے ہیں۔ ان میں سے آخری نقاد انیسویں صدی عیسوی کے عظیم عالم اور بے مثال ادب شناس، شبلی نعمانی (۱۲۷۴۔۱۳۳۲ھ/ ۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء) ہیں۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں، جب ایران میں ادبی تنقید کا دورِ عروج صرف صاحبِ تذکرۂ نصرآبادی اور مصنف آتش کدۂ آذر کے جملوں کو مانا جاتا ہے، ہندوستان میں ادبی تنقید کے میدان میں عظیم اقدامات کیے گئے ہیں''۔(۵)

یہ برصغیر کے ان متعدد امتیازات اور اولیات کی ایک جزوی تصویر ہے، جو وہ فارسی زبان و ادب کے توسط سے اسلامی تمدن و تہذیب کی خدمت اور شراکت کے حوالے سے رکھتا ہے۔ اس ابتدائیہ کا مقصد فارسی زبان و ادب اور تہذیب سے برصغیر کی ہزار سالہ قدیم وابستگی سے آگاہی ہے۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں طباعت کی صنعت وارد ہوئی اور برصغیر نے اسلامی تمدن اور فارسی ادب وتہذیب کی خدمت میں ایک اور بڑا قدم اٹھا کر یہ امتیاز اپنے نام کیا۔ ۱۷۸۱ء میں جب کلکتہ سے ہرکرن داس متھرا ملتانی کی تصنیف انشای ہرکرن شائع ہوئی تو، یہ ہماری تحقیق کے مطابق فارسی کی پہلی مکمل کتاب ہے جو برصغیر میں طبع ہوئی۔ ایران میں جدید چھپائی کے لیے پرنٹنگ مشین ۱۲۳۲ھ/ ۱۷-۱۸۱۶ء میں شہزادہ عباس میرزا نے تبریز میں لگائی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں برصغیر کے بڑے شہروں: لاہور، لکھنؤ، کان پور، بمبئی، مدراس اور دہلی میں مزید ترقی یافتہ مطابع قائم ہوئے اور وسیع پیمانے پر فارسی کتب کی طباعت کا کام ہونے لگا۔ سنگی طباعت کے آغاز کو برصغیر میں طباعت کی تاریخ کا اہم موڑ سمجھا جا سکتا ہے۔ صورت حال کچھ یوں تھی کہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بہت سے اسلامی ممالک میں دینی کتب کی اشاعت ناروا سمجھی جاتی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے حالات بھی طباعت کے معاملہ میں مختلف نہ تھے۔ لیکن انیسویں صدی میں آزادی اور قومی و اصلاحی تحریکوں کے تحت برصغیر کے مسلمانوں نے بہت جلد صورت حال کا ادراک کر لیا اور مذہبی کتب کی طباعت کا آغاز کر دیا۔ دوسری جانب ہندوستان میں مطبوعہ کتب کی تجارت زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور اس قسم کی کتب کی اشاعت مالی لحاظ سے بھی ان کے لیے فائدہ مند تھی۔ الویس اشپرنگر (۱۸۰۳-۱۸۹۳ء Aloys Sprenger) کے بیان کے مطابق اگرچہ ۱۸۵۴ء تک یعنی ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت سے تین سال قبل تک لکھنؤ اور کان پور میں پتھر کی سلوں کے ذریعہ چھپائی کرنے والے چھاپہ خانوں میں یہ تعداد صرف سات سو نسخوں تک ہی پہنچ پائی تھی، لیکن اسی محدود تعداد کے باوجود باذوق مذہبی قارئین کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا۔ انہی کتابوں نے برصغیر کے معاشرے میں خواتین قارئین کا حلقہ بھی وسیع کیا تھا۔

مسلمانوں کے ماخذ مخطوطات کی صورت میں چند کتب خانوں اور افراد تک محدود تھے اور صدیوں سے مسلمانوں کی اپنے اصل منابع تک رسائی نہ تھی۔ لیکن طباعت کے آغاز سے اصل متون اور منابع تک ان تک پہنچ عام ہوگئی۔ قرآن مجید کے نسخے اور حدیث وفقہ کے متون، جو طباعت کی صنعت کے اوائل میں طبع ہوئے، دنیائے اسلام کے اولین مطبوعہ متون تھے۔ مسلمانوں میں مذہبی اصلاح اور قومی بیداری کی تحریکیں اس زمانے کے آخر تک مزید وسعت اختیار کر گئیں۔ شاہ عبدالعزیز

محدث دہلوی (۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) کے خانوادے اور ان کے شاگردوں نے اپنے مخصوص تحریکی ادب کی وسیع تر پیمانے پر اشاعت کی۔ عبداللہ سیرام پوری نے کلکتہ میں مطبع احمدی قائم کیا۔ جس نے آٹھ سال کی مدت میں جہادی ادب وافر مقدار میں مطبوعات کی منڈی تک پہنچا دیا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف ایک سال (۱۸۷۱ء) کے عرصے میں قرآن مجید کے تیس ہزار نسخے شائع ہوئے اور مطبوعہ کتابیں ہندوستان تک محدود نہ رہیں بلکہ افغانستان کے راستے وسط ایشیا تک بھی جا پہنچیں۔ ان روزافزوں اشاعتی سرگرمیوں نے علمائے اسلام کے توسط سے علمی، تعلیمی اور اصلاحی و مناظراتی تحریکات کی صورت اختیار کر لی۔ چونکہ برصغیر میں مطابع کی صنعت کا انحصار مسلم علما پر تھا، طباعت، مسلمانوں کے لیے ایسے ہتھیار کی صورت اختیار کر گئی جسے علماے اسلام نے ہندو اور مسیحی تحریکوں کے خلاف استعمال کیا۔ ان کی توجہ اسلامی ادب اور قدیم مذہبی متون کے تراجم پر مرکوز ہوئی اور متعدد مطابع معارف اسلامی کی اشاعت میں فعال اور حصہ دار تھے۔ علمائے اسلام، برصغیر کی تاریخ میں کبھی بھی اتنے موثر نہ رہے تھے جتنے طباعت کی صنعت کے انقلاب کے بعد ہو گئے تھے۔ صرف شاہ عبدالعزیز کی تحریک کے علما نے ہی طباعت کے ہتھیار سے استفادہ نہ کیا، بلکہ ان کے مدمقابل مکاتب فکر علماے فرنگی محل، اہل حدیث، دیوبند اور شیعہ نے بھی طباعت کی صنعت کے وسیلے سے اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ (۶)

مثال کے طور پر ان کتابوں کے صرف چند اعداد و شمار پیش ہیں جو شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تحاریک کے زیر اثر طبع ہوئیں:

فتح الرحمان، قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، از شاہ ولی اللہ دہلوی، ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران ۵۸ بار شائع ہوا۔ (۷)

فتح العزیز یا تفسیر عزیزی، از شاہ عبدالعزیز دہلوی، ۱۸۳۳ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران ۴۲ بار طبع ہوئی۔ (۸)

تحفۂ اثنا عشریہ، از شاہ عبدالعزیز دہلوی، ۱۸۰۰ء سے ۱۹۸۳ء کے دوران ۱۲ بار طبع ہوئی۔ (۹)

برصغیر میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج میں مطبع نول کشور کے کردار کا ذکر نہ کرنا، ناانصافی

ہوگا۔اس مطبع کے مالک منشی نول کشور(۱۸۳۶۔۱۸۹۵ء) گو ہندو تھے،لیکن مذہبی تعصب سے بالاتر ہوکر اسلامی موضوعات تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، سیرت النبی، تاریخ اسلام، تصوف، ادب پر مسلسل کتب طبع وشائع کرتے رہے۔ہندوستان میں اس مطبع کی کئی شاخیں تھیں اور انیسویں صدی عیسوی میں جنوبی ایشیا میں اس نے کتب کی تیاری، طباعت اور تجارت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔(۱۰)

اگر ہم برصغیر میں مطبوعہ کتب کا جائزہ لیں تو کسی مبالغہ کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر، انیسویں صدی عیسوی میں فارسی کتب کی طباعت واشاعت کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز تھا۔اگر ہندوستان میں مطبع معرض وجود میں نہ آتا تو فارسی زبان وادب کا ذوق اور دلچسپی یہاں کے لوگوں میں بہت جلد پھیکا پڑ چکا ہوتا، جیسا کہ اب پڑ چکا ہے۔ایران، جو آج فارسی کا اُمّ القریٰ اور فارسی کتب کی طباعت واشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے، علم وفن کے ہر موضوع پر کتابیں چھاپ رہا ہے۔وہاں ان کتابوں کی ازسرنو اشاعت کی طلب رہتی ہے جو کسی زمانے میں برصغیر میں طبع ہوئی تھیں۔چنانچہ اب تک وہاں برصغیر کی پچاسیوں کتب کو عکسی یا ازسرنو کتابت کرواکر شائع کیا جاچکا ہے۔یہ اس لیے بھی ہے کہ یہ کتابیں ایران اور برصغیر کے مشترکہ اسلامی، تہذیبی، ادبی تعلقات پر اثرات مرتب کرتی ہیں۔

میں نے کئی سال محنت کرکے، برصغیر میں اب تک شائع ہونے والی فارسی کتابوں کی ایک کتابیات مرتب کی جو کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ نام سے مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران نے ۲۰۱۲ء میں چار جلدوں میں شائع کی۔یہ ۱۷۸۱ تا ۲۰۰۷ء کے درمیانی عرصے میں ہندستان، پاکستان، بنگلادیش (اور برما) کے چھاپہ خانوں میں چھپنے والی فارسی کتب کی فہرست ہے۔اس میں ۱۰۵۸۹ عنوانات کے تحت ۲۰۶۲۸ مطبوعہ نسخوں کے کوائف کا اندراج ہوا ہے۔اس کتاب کا ایک بڑا حصہ اسلامی علوم وفنون، تاریخ وتمدن سے متعلق ہے۔کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ میں ''اسلام'' کا باب الگ ہے اور اس میں مندرجہ ذیل موضوعات کی کتب متعارف ہوئی ہیں:

الف: قرآن مجید اور علوم قرآنی۔جس میں تراجم، تفاسیر اور کتب قرأت وتجوید وغیرہ شامل ہیں۔

ب: حدیث۔اس میں اصولِ حدیث، اور اہل سنت وشیعہ کی احادیث کی کتب

شامل ہیں۔

ج: کلام، عقائد، ردود اور مناظرہ۔ میری نظر میں یہ کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ ہے، جو برصغیر کے مذہبی اور کلامی معاشرے کے ادراک میں مدد کرتا ہے اور برصغیر میں تاریخ کلام لکھنے کے خواہاں افراد کے لیے اس حصے سے رجوع ناگزیر ہے۔

د: اصول فقہ وفقہ۔

ھ: اسلامی فرقے۔

و: تصوف وعرفان۔

بنیادی علوم وطبیعیات کے حصوں میں تجرباتی علوم اور فنون کی متعدد کتب کی نشان دہی کی گئی ہے۔ طب کے شعبہ میں برصغیر میں مطابع کی خدمات بہت قابل قدر ہیں۔ حصۂ تاریخ میں سیرت النبیؐ اور تاریخ صدر اسلام اور خلفا پر لکھی گئی کتب کا اندراج کیا گیا ہے۔ اسی حصہ میں، میں نے برصغیر میں نعت النبیؐ پر شائع ہونے والی منظوم فارسی کتب کی فہرست شامل کی ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کی حضرت رسول اکرمؐ سے عقیدت کا ایک ادبی ثبوت ہے۔

مولانا جلال الدین محمد رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳ء) اسلامی-انسانی ادب کی ایک عالمی علامت بن چکے ہیں۔ برصغیر میں مولانا کے تئیں جو احترام پایا جاتا ہے، وہ اس احترام سے کم تر نہیں جو دیگر اقوام مشرق کے ہاں ہے۔ کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ کے حصۂ ادبیات میں مثنوی مولوی کی متعدد طباعتوں کے ساتھ ساتھ، اس سے متعلقہ موضوعات (انتخاب، ترجمہ، شرح) پر برصغیر میں طبع شدہ ۶۴ کتب کا اندراج موجود ہے، جو مثنوی شریف سے متعلقہ ہیں۔ مثنوی کی اولین طباعت ۱۸۳۶ء میں لکھنو میں ہوئی تھی۔ مولانا روم اور سلسلۂ مولویہ کے بزرگوں کے حالات اور کرامات پر شمس الدین احمد افلاکی (وفات: ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء) کی کتاب مناقب العارفین، پہلی اشاعت انتخاب کی صورت میں ۱۸۹۷ء میں آگرہ میں ہوئی تھی۔

مختصر یہ کہ برصغیر میں طباعت کی صنعت، اسلامی تہذیب کے احیا، حفاظت اور اشاعت کے لیے ایک اہم ذریعہ رہی ہے۔ فارسی زبان اس تہذیب کا ایک رکن رکین ہے، اس نسبت سے برصغیر میں فارسی کتب کی اشاعت، اسلامی تہذیب کی ایک عظیم خدمت ہے۔ کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ

درشبہ قارہ ایک ایسی دستاویز ہے جواس نظریے کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتی ہے کہ برصغیر میں مسلمان ایک بڑی مذہبی اقلیت اورانیسویں صدی میں انگریز سامراج کے زیر تسلط ہونے کے باوجود، پُرعزم رہے اورانہوں نے اپنے عقائد، تاریخ، روایت اورتہذیب کی حفاظت اورعلوم وفنون کی خدمت کی۔ اسلامی تمدن کی تاریخ لکھنے والا کوئی بھی شخص برصغیر کے مسلمانوں کی خدمات کونظرانداز نہیں کرسکتا اور کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ درشبہ قارہ اس کا معتبر حوالہ ہے۔

حواشی

(۱) محمد بن عبدالوہاب قزوینی، ترجمہ مصنف مشمولہ لباب الالباب، بہ سعی واہتمام وتصحیح ایڈورڈ براؤن، لیڈن، ۱۹۰۶ء، صفحات: یح، یط، کا۔ (۲) نذیر احمد، مقدمہ فرہنگ قواس، کتاب خانہ رضا رام پور، ۱۹۹۹ء، صفحات: ۱-۱۷۔ (۳) ریحانہ خاتون، مقدمہ، مثمر، کراچی، ۱۹۹۱ء۔ (۴) احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ج ۷، صفحات ۱۳۰-۱۵۸۔ (۵) محمد رضا شفیعی کوکنی، شاعری درہجوم منتقدان، تہران، ۱۳۷۵ ش، ص: ۱۸-۱۹۔ (۶) معین الدین عقیل، تاریخچۂ چاپ کتاب ھای فارسی درشبہ قارہ، ترجمۂ عارف نوشاہی، ضمیمۂ ۲۵ آئینۂ میراث، تہران، سال دہم، ۱۳۹۱ ش/ ۲۰۱۲ء؛ معین الدین عقیل، جنوبی ایشیا میں طباعت کا آغاز وارتقا (مسلمانوں کی طباعتی سرگرمیاں اورقومی بیداری)، شعبۂ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی، ۲۰۱۴ء۔ (۷) عارف نوشاہی، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ درشبہ قارہ، تہران، ۲۰۱۲، ج ۱، ص ۳۵۵-۳۵۷۔ (۸) ایضاً، ص ۳۶۷-۳۶۸۔ (۹) ایضاً، ص ۴۲۷-۴۲۸۔ (۱۰) ملاحظہ ہو: سید امیر حسن نورانی، سوانح منشی نول کشور، پٹنہ: آصفہ زمانی، یاد بود منشی نول کشور، ترجمۂ ظہیر عباس ریحان تہران؛ چندر شیکھر وعبدالرشید (مرتبین)، فہرست کتب مطبع منشی نول کشور ۱۸۹۶ء، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

(مصنف نے یہ مقالہ ۱۰ دسمبر ۲۰۱۲ء کو استنبول کے مرکز البحوث الاسلامیہ (ISAM) میں منعقدہ سمینار ''برصغیر ہندو پاک میں فارسی مطبوعہ کتب کی اہمیت اسلامی اور ترک مطالعات کے نقطۂ نظر سے''
Importance of Persian Printed Books in Indo-Pak Subcontinent from the Point of Islamic and Turkolgy Studies میں پڑھا۔ اس کا اصل یا ترجمہ تاحال شائع نہیں ہوا تھا۔ اب اس میں مناسب ترمیم اورنظر ثانی کرکے پیش کیا جارہا ہے)

معارف کی ڈاک

غیر مسلم مصنّفین اور سیرت نبویؐ

۱۲؍اکتوبر ۲۰۱۸ء

ایف-۷ ۲۳، لوئر ہری سنگھ نگر،

اہاڑی کالونی، جموں، ۱۸۰۰۰۵

محب مکرم مدیر اعلیٰ! آداب

ماہنامہ معارف کے شمارہ اگست ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا مضمون ''غیر مسلم مصنّفین اور سیرت نبویؐ'' نظر نواز ہوا، جس میں مقالہ نگار نے ان ہندو مصنّفین کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے اپنی عقیدت کے پھول آنحضرتؐ کے قدموں میں نچھاور کیے ہیں، ساتھ ہی قرآنی تعلیمات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا۔ اتنا ہی نہیں قرآن و گیتا کا تقابل بھی پیش کیا ہے۔ جس سے دونوں مذہب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے دکھائی دیے ہیں۔

بادشاہ اکبر کے عہد میں مہابھارت کے ۶، رامائن کے ۲۴، بھگوت پران کے ۱۱، بھگوت گیتا کے ۸۔ اور یوگ وششٹ کا فارسی میں ایک ترجمہ ہوا تھا۔ اس وقت دفتری اور عوام کی عام زبان فارسی تھی۔

دارا شکوہ ان سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے ۵۲ اُپنشدوں کے فارسی میں ترجمے کروائے۔ اس نے یوگ وششٹ کا دوبارہ ترجمہ حبیب اللہ سے کروایا، ساتھ ہی سمندر سنگم کا ترجمہ بھی ۱۶۵۵ء میں کروایا۔

سترہویں صدی عیسوی کے آخر سے بیسویں صدی کے آخر تک قرآن مجید کے ایک سو پانچ تفسیریں اور ترجمے اردو میں ہوئے۔

لیکن ہندی میں قرآن مجید کے سب سے اول ترجمہ کا ذکر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' کے صفحہ ۲۸ پر بزرگ بن شہریار سنہ ۳۰۰ھ کی کتاب ''عجائب الہند'' کے حوالے سے کیا ہے جو ایک جہاز راں تھا۔ اس کتاب میں '' گجرات کے متعلق واقعات ملتے ہیں۔ ان میں

سب سے اہم واقعہ ایک ہندو راجہ کا قرآن کا ہندی میں ترجمہ کرا کر سننا ہے"۔ یعنی یہ ترجمہ ۹۱۲ھ کا ہے۔

راقم کی ناقص معلومات کے مطابق آج تک شری مد بھگوت گیتا جی کے چوراسی اردو ترجمے ہو چکے ہیں، جن میں آخری منظوم ترجمہ انور جلال پوری لکھنؤ کا ہے۔ (اب مرحوم ہو چکے ہیں)

میرے پاس پندرہ اردو ترجمے موجود ہیں، جن میں چار مسلم حضرات کے ہیں: دل محمد، محمد اجمل خاں، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور ڈاکٹر شان الحق حقی۔

راقم کے پاس موجود سبھی ترجموں کی تفصیل میرے مضمون "شری مد بھگوت گیتا" کے مترجم ڈاکٹر شان الحق حقی ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی کے شمارہ یکم تا ۷/ جون اور ۸/ تا ۱۴/ جون ۲۰۰۶ء میں شامل ہے۔ راقم کے پاس دو سنسکرت اور دو ہندی میں بھی موجود ہیں۔

آپ یہ سن کر حیران ضرور ہوں گے کہ راقم سنسکرت سے نابلد ہے۔ ساری زندگی گیتا جی کا پاٹھ میں اردو میں کرتا آیا ہوں۔ معلوم نہیں مجھے جنت نصیب ہوگی یا جہنم۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ نماز ادا کرنے سے پہلے نیت باندھی جاتی ہے، میں اس پر قائم ہوں پاٹھ کرنے سے پہلے نیت باندھ لیتا ہوں۔ میں اس وقت عمر کے ۷۵ ویں پڑاؤ سے گزر رہا ہوں۔

میرے پاس قرآن شریف کے چار ترجمے موجود ہیں۔ پہلا ترجمہ اوپر عربی اور نیچے اردو کا ہے (تاج کمپنی لاہور کا)۔ دوسرا اردو، تیسرا انگریزی اور چوتھی تفسیر مدینہ منورہ کی ہے۔ ان کے علاوہ سیرت نبویؐ پر لکھی ہوئی صفی الرحمٰن مبارک پوری کی "الرحیق المختوم" اردو میں ہے۔ اس کا مطالعہ کئی بار کر چکا ہوں۔ "علیؓ دی میگنی فشنٹ" انگریزی میں، "خلافت وملوکیت" کے علاوہ بہت سی کتابیں اسلام سے متعلق میرے پاس ہیں۔ سکھوں کا روزانہ پاٹھ کرنے والا گوٹھکا جپ جی صاحب بھی اردو میں ہے۔ بائبل کے دونوں نسخے اولڈ اینڈ نیو اردو وانگریزی میں موجود ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے اور شایداً کتا بھی رہے ہوں گے کہ اس تفصیل کو یہاں درج کرنے سے میرا مقصد کیا ہے؟ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں وسیع النظری سے ایک دوسرے کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ موجودہ دور میں ملک کے اندر جو دن بہ دن انتشار پھیلتا جا رہا ہے اسے کم سے کم کیا جا سکے۔ اس بات کے لیے اردو رسائل میں اور خاص کر معارف میں گاہے گاہے ایسے مضامین شائع کیے جانے چاہئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے ایسے مضامین کا مطالعہ کر سکیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی کے مضمون سے مجھے تحریک ملی ہے اور میں نے ''شری مد بھگوت گیتا اور مسلم مصنّفین''، قلم بند کیا ہے، جسے معارف کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ اسے ایک نظر ضرور دیکھ لیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اسے معارف کے اوراق میں شامل ہونے کا شرف ضرور حاصل ہوگا۔ یہ مضمون میرے بیس دنوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔

آخر میں اس بات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا کہ دل محمد، محمد اجمل خاں اور اثر صاحب کے ترجمے تقسیم وطن سے قبل کے ہیں، مگر ڈاکٹر شان الحق حقی پیدا دہلی میں ہوئے، تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی اور تقسیم وطن کے بعد کراچی (پاکستان) کو اپنا مسکن بنالیا اور اسی سرزمین پر بیٹھ کر بھگوت گیتا جی اور چانکیہ کے ارتھ شاستر کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے گیتا جی کا ترجمہ کیوں کیا۔ اس کا مختصر ذکر مضمون کے شروع میں درج ہے۔ بھگوان شری کرشن جی مہاراج سے ان حضرات کی والہانہ عقیدت کا ذکر آپ کو اس مضمون میں ملے گا۔

نیازمند

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا

ابن رشد کی ایک طبی کتاب

دہلی

۲۴/۱۱/۲۰۱۸ء

مکرمی مدیر معارف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

نومبر کا معارف نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر فواد سزکین پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کا قسط وار مضمون بہت ہی معلوماتی اور وقیع ہے۔ اردو اور غالباً انگریزی میں بھی سزکین کے علمی کارناموں کا ایسا مفصل تعارف ابھی تک نہیں آسکا ہے۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا مضمون ابن رشد کی ایک طبی کتاب پر ہے۔ ضمناً ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد کا ذکر آیا ہے۔ مضمون نگار نے اسے فقہ مالکی کی کتاب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کی کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد جس کا تعلق فقہ مالکی

سے ہے...."۔

آگے لکھتے ہیں:

"فلسفہ کی طرح فقہ مالکی میں بھی جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، ابن رشد کی حیثیت مسلم ہے۔ اس کی کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد آج بھی فقہ مالکی کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اور ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے"۔

ابن رشد کی یہ کتاب فقہ اسلامی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اس کا موضوع فقہ مالکی کے بجائے تقابلی اسلامی فقہ ہے۔ یہ پہلی اور شاید آخری کتاب ہے جو دور تقلید میں اجتہاد کے آداب سکھاتی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ابن رشد صرف اجتہاد کے نظری پہلو کو اجاگر نہیں کرتے بلکہ پوری کتاب میں نہ صرف ائمہ اربعہ بلکہ تمام کبار ائمہ مجتہدین کی آرا کو پیش کرتے ہیں اور اختلاف کے اسباب تلاش کرکے متعلق مسئلہ کا تجزیہ کرتے اور راجح رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابن رشد نے کتاب کے مقدمہ میں اس کی تالیف کا مقصد اس طرح بیان کیا ہے:

فان غرضی فی هذا الکتاب ان اثبت فیه لنفسی علی جهة التذکرة من مسائل الاحکام المتفق علیها والمختلف فیها بادلتها، والتنبیه علی نکت الخلاف فیها مایجری مجری الاصول والقواعد لما عسی ان یرد علی المجتهد من المسائل المسکوت عنها فی الشرع، وهذه المسائل فی الاکثر هی المسائل المنطوق بها فی الشرع او تتعلق بالمنطوق به تعلقا قریبا وهی

اس کتاب کی ترتیب وتالیف کا مقصد یہ ہے کہ بطور یادداشت متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل کو ان کے دلائل کے ساتھ محفوظ کرلیا جائے، اور ساتھ ہی ساتھ ان اختلافی نکات واسباب کی نشان دہی بھی کردی جائے، جو آیندہ پیش آنے والے مسکوت عنہا مسائل میں ایک مجتہد کے لیے اصول وقواعد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں جن مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تر منطق بہا یا ان سے قریبی تعلق رکھنے والے مسائل ہیں جن پر یا تو اتفاق رہا ہے یا فقہائے اسلام کے درمیان ان کے سلسلہ میں ایسا اختلاف پایا جاتا ہے جو صحابہ کے

المسائل التی وقع الاتفاق علیھا، او اشتھر الخلاف فیھا بین الفقھاء الاسلامیین من لدن الصحابہ رضی اللہ عنھم الی ان فشا التقلید۔

زمانے سے لے کر آغاز تقلید کے عہد تک مشہور و معروف رہا ہے۔(مقدمہ بدایۃ المجتہد، ترجمہ مولانا بشیر احمد اصلاحی)

کتاب کے مطالعہ سے کہیں بھی فقہ مالکی سے اس کی وابستگی کا اشارہ نہیں ملتا۔محمد یونس انصاری ابن رشد پر اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ "اس کتاب کی بڑی صفت یہ ہے کہ دیگر کتب فقہ کے خلاف اس کی غرض اجتہاد کی استعداد پیدا کرنا ہے"۔ "ابن رشد گو مالکی المذہب ہے لیکن محاکمہ میں بے تعصبی کے ساتھ رائے ظاہر کرتا ہے، اپنے مذہب کی بے جا تائید و حمایت کا مقلدانہ جوش کہیں نظر نہیں آتا۔چنانچہ اکثر جگہ حنفیہ کی متانت استدلال و قوت فقہائیت کو تسلیم کیا ہے"۔(ص ۱۵۲، ۱۵۵)

کتاب کی انہی خصوصیات کی بنا پر یہ شروع ہی سے مدرسۃ الاصلاح کے تعلیمی نصاب کا بنیادی حصہ رہی ہے اور آج بھی فضیلت میں داخل درس ہے۔دسمبر ۱۹۶۹ء میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی میزبانی دارالمصنّفین نے کی تھی، کانفرنس کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی نے جو کچھ ہی دنوں قبل مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے، فقہ میں ابن رشد کے مقام پر مضمون پڑھا تھا۔یہی مضمون بعد میں "بدایۃ المجتہد ابن رشد" کے عنوان سے معارف اگست ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

والسلام جناب طلحہ ایوب اصلاحی

وفیات

پروفیسر فواد سزکین

اشتیاق احمد ظلی

(۴)

۴۔خطبات: پروفیسر سزکین نے اپنے طویل علمی سفر کے دوران دنیا کی مختلف جامعات، سیمیناروں اور مذاکروں میں بے شمار خطبات پیش کیے۔ بد قسمتی سے ہمارے لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں ہے کہ وہ کس حد تک محفوظ ہیں۔ان کے علمی مقام و مرتبہ کے پیش نظر زیادہ امکان یہی ہے کہ ان کو محفوظ رکھا گیا ہوگا۔اگر ان کی اشاعت ہوئی ہوگی تو وہ بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح جرمن زبان میں ہوں گے۔بہرصورت وہ ہماری دست رس سے باہر ہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔البتہ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض کی دعوت پر انہوں نے جو لکچر دیے تھے ان کو جامعہ نے ۱۳۹۹/ ۱۹۷۹ میں ''محاضرات فی تاریخ العلوم'' کے نام سے شائع کردیا تھا۔یہ خطبات سات اہم موضوعات پر دیے گئے تھے۔ بعد میں یہ مجموعہ چھ مزید خطبات کے اضافہ کے ساتھ ''محاضرات فی تاریخ العلوم العربیہ'' کے نام سے ۱۴۰۴ / ۱۹۸۴ میں فرینکفرٹ سے شائع ہوا۔البتہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ اضافی چھ خطبات کہاں دیے گئے تھے۔یہ خطبات جہاں بھی دیے گئے ہوں موضوع کی مناسبت سے انہیں بھی اس مجموعہ میں شامل کردیا گیا اور اس طرح اس کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہوگیا۔اب یہ مجموعہ تیرہ خطبات پر مشتمل ہے۔ان خطبات کو پاکستان کے مشہور مصنف اور محقق ڈاکٹر خورشید رضوی نے اردو کا قالب عطا کیا ہے۔یہ ترجمہ ''تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام'' کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا اور وہی ہمارے پیش نظر ہے۔

ان خطبات میں پروفیسر سزکین کے مدۃ العمر کے مطالعہ،غور و فکر اور تحقیق کا نچوڑ آ گیا ہے۔

جو نتائج انہوں نے اپنے عظیم علمی اور تحقیقی پروجیکٹ ''تاریخ التراث العربی'' سے حاصل کیے تھے ان کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان خطبات میں پیش کر دیا گیا ہے چنانچہ جن لوگوں کے لیے زبان کی اجنبیت یا کسی اور سبب سے اس غیر معمولی سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ ممکن نہ ہو وہ ان خطبات کے ذریعہ ان کے بنیادی نتائج تحقیق سے ضروری حد تک واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

ان خطبات کے وسیلہ سے یہ بات پوری صراحت اور وضاحت سے سامنے آ جاتی ہے کہ علوم کی تاریخ میں مسلمان علماء کے عطایا کی نوعیت اور قدر و قیمت کیا ہے اور اس میدان میں ان کی خدمات کو کیسی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں کے دوران جس کا سلسلہ دراصل نام نہاد تحریک احیاء علوم (Renaissance) سے شروع ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حقائق کے کتمان اور ایک سوچے سمجھے منظم منصوبہ کے تحت ایک جعلی اور من گھڑت تاریخ علوم کی تخلیق کی مغربی علماء نے جو کوشش کی اور جس کے حصول کے لیے ان کے اعلیٰ ترین دماغوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اور غیر معمولی وسائل کا استعمال کیا گیا اور اس طرح ایک ایسا بیانیہ تیار کیا گیا جس کا حقیقت واقعہ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا، اس کا پردہ چاک ہو گیا اور حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ گئی۔ یہ پروفیسر سزگین کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کو دوسرے تمام محققین سے ممتاز کرتا ہے۔ مسلمان یونانیوں کی گاڑی کے قلی نہیں تھے بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ وہ ان کے اور پوری انسانیت کے محسن تھے۔ اگر انہوں نے اس علمی ورثہ کی حفاظت نہ کی ہوتی تو نہ جانے اس کا کتنا حصہ دست برد زمانہ اور گردش لیل و نہار کی نذر ہو گیا ہوتا۔ انہوں نے اس علمی ورثہ کو تراجم کے ذریعہ محفوظ کیا، اس کی کمیوں اور غلطیوں کی اصلاح کی اور اس کو ترقی دی۔ انہوں نے اپنے ان پیش رووں کے لیے ہمیشہ احترام اور تشکر کے جذبات کا اظہار کیا اور جہاں جہاں ان پر تنقید کی ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے اپنی آراء کا اظہار کیا لیکن اس فریضہ کی ادائیگی میں انہوں نے متکبرانہ روش اختیار نہیں کی بلکہ ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاس داری کی۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی اساس انہی کی تحقیقات اور اختراعات پر قائم ہے اگرچہ یوروپ نے اس کے کتمان اور انکار میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ احسان فراموشیوں کی سیاہ تاریخ میں بھی یہ احسان فراموشی اور محسن کشی بے مثال رہے گی۔

اس وقت ان قیمتی اور نہایت اعلیٰ درجہ کے خطبات کا محض تعارف مقصود ہے۔ لیکن یہ تعارف

نہ تو اصل خطبات کے مطالعہ کا قائم مقام ہوسکتا ہے اور نہ بدل۔ زیر گفتگو موضوعات کی اہمیت اور ان کے محتویات کی غیر معمولی قدر و قیمت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر خطبہ کا الگ الگ مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے لیکن سر دست یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ پہلے ان خطبات کے موضوعات کی فہرست پیش کی جاتی ہے اس کے بعد ان میں پیش کیے جانے والے بعض حقائق اور نکات کا مختصراً ذکر کیا جائے گا اگرچہ یہ کام سخت مشکل ہے اس لیے کہ ہر بحث کی کیفیت یہ ہے کہ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست۔

خطبات کے موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ التراث العربی: تالیف کے مقاصد اور طریق کار۔

۲۔ تاریخ علوم میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۳۔ تاریخ طب میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۴۔ علم کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۵۔ ریاضیات کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۶۔ فلکیات کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۷۔ عربوں کی فلکیات کا یوروپ پر اثر۔

۸۔ آثار علویہ (Metreorology) کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔

۹۔ یوروپ کی تاریخ احیا پر عربی اسلامی علوم کا اثر۔

۱۰۔ عربی اور اسلامی علوم میں اسناد کی اہمیت۔

۱۱۔ کتاب الاغانی کے مآخذ۔

۱۲۔ قدیم عربی شاعری: حقیقت یا افسانہ۔

۱۳۔ اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب۔

ان موضوعات پر بنیادی معلومات ''تاریخ التراث العربی'' کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ابتدائی منصوبہ کے مطابق ''تاریخ التراث العربی'' جس کو پروفیسر سزکین کا حاصل زندگی کہنا چاہیے، دس جلدوں میں مکمل ہونی تھی۔ اس کے بعد ایک جلد اشاریہ کے لیے مختص ہوتی۔ جلدوں کے مشتملات اور ترتیب کے تعلق سے جو تفصیلات فراہم کی گئی ہیں ان میں پانچویں جلد کے بعد عملاً کچھ

تبدیلیاں کی گئیں (۱)۔ان جلدوں میں ۴۳۰ھ تک علوم کی تاریخ کا احاطہ کرنے کا منصوبہ تھا۔اس کی تکمیل کے بعد مصنف کا ارادہ یہ تھا کہ اگر عمر نے وفا کی اور کچھ مزید فرصتِ حیات میسر آئی تو آیندہ جلدوں میں ۴۳۰ھ سے گیارہویں صدی ہجری تک تاریخ علوم کا احاطہ کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ نے مصنف کی عمر اور وقت میں برکت دی اور ان کو اپنے پروگرام کے مطابق اس عظیم الشان تحقیقی منصوبہ کی سترہ جلدوں کو مکمل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔اٹھارہویں جلد پر کام جاری تھا کہ وقت موعود آگیا اور یہ جلد ناتمام رہی۔حسب وعدہ انہوں نے بعد کی جلدوں میں اپنی تحقیق کے دائرہ کار کو گیارہویں صدی ہجری تک بڑھا دیا تھا۔قحط الرجال کے اس دور میں دیکھیے اس منصوبہ کی تکمیل کی کوئی صورت بنتی بھی ہے یا اور بھی بہت سے منصوبوں کی طرح مصنف کے انتقال کے بعد ملت کی حسرتوں کی طویل فہرست میں اس کی تکمیل کی حسرت کا بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے طبیعی علوم کی طرف کافی تاخیر سے توجہ دی۔اس کے لیے دوسری صدی ہجری کے اواخر کا تعین کیا جاتا ہے اور اس کا مظہر بیت الحکمت کی تاسیس کو مانا جاتا ہے۔پروفیسر سزگین کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ابتدائی مسلم معاشرہ میں دینی علوم کی طرح طبیعی علوم کی ابتدا بھی پہلی صدی ہجری میں ہوگئی تھی۔یہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں سے علوم کے ترجمہ کا کام بھی پہلی صدی ہجری میں شروع ہوچکا تھا (۲)۔گذشتہ کئی صدیوں سے بلکہ تحریک احیاء کی ابتدا ہی سے یوروپ نے بڑے اہتمام سے اس نقطہ نظر کی پرورش اور پروپیگنڈہ کیا ہے کہ انسانی تاریخ میں علوم کے ارتقاء کے صرف دو مرحلے رہے ہیں جو یوروپ کی جغرافیائی حدود تک محدود ہیں۔پہلے مرحلہ کا تعلق یونان سے ہے جہاں ان کے اپنے زعم اور دعوی کے مطابق علوم کی ابتدا ہوئی اور دوسرا مرحلہ یوروپ میں ان علوم کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا ہے جسے اصطلاحی طور پر Renaissance کا نام دیا جاتا ہے۔گویا یونانیوں کے تاریخ کے اسٹیج پر ظہور سے پہلے انسانیت علم سے یکسر نابلد تھی۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے جس کے لیے دراصل اس جعلی نقطہ نظر کو ایجاد کیا گیا، کہ یونان کے عہد کے بعد اور تحریک احیاء کی ابتدا تک کا طویل عرصہ علمی حیثیت سے بالکل بنجر تھا اور اس میں کہیں علمی نمو اور ارتقاء کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اہل یوروپ کے بقول پورا مسلم عہد اسی بنجر دور سے تعلق رکھتا ہے۔چنانچہ جدید علوم کی اساس یونانی علمی ورثہ پر رکھی گئی اور اس مقصد کے حصول کے

لیے یونان کے قدیم علوم کا احیاء عمل میں آیا (۳)۔اس سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علوم کی ابتدا اور ارتقا تمام تر یوروپی اقوام کے عطایا پر منحصر ہے وہیں یہ بات بھی ازخود ثابت ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کا علوم کی تاریخ میں نہ تو کوئی حصہ ہے اور نہ کوئی مقام۔عجیب بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان بھی نشاۃ ثانیہ کے اسی جعلی تصور کو پورے جوش وخروش سے پڑھاتے ہیں اور انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سے ان کی اپنی تاریخ کس طرح مسخ ہوتی ہے۔ان کو اس کا کوئی ادراک نہیں کہ ان کی اپنی تاریخ اس سلسلہ میں کتنی روشن اور تابناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علوم کی تاریخ میں یونان کا مقام اولیت کا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے وسط میں آتا ہے۔علوم کی ابتدا اور پھر ارتقاء کا سلسلہ اس سے بہت پہلے سے جاری تھا۔ڈنمارک کے مشہور اسکالر اوٹو نویگباور (Otto Neugebaur) کی تحقیقات کے مطابق تاریخ علوم میں یونانیوں کو اولیت کا مقام حاصل نہیں ہے۔یونانیوں سے ڈھائی ہزار سال پہلے سے علمی پیش رفت کا قابل لحاظ ورثہ موجود تھا۔ چنانچہ اب یہ بات علم وتحقیق کی سطح پر محتاج ثبوت نہیں رہ گئی ہے کہ علوم کی ابتدا یونانیوں کے عہد میں نہیں ہوئی تھی بلکہ ان سے ڈھائی ہزار سال پہلے سے اس کا ایک تسلسل چلا آرہا تھا۔اسی طرح یہ بات بھی اب ثبوت کی محتاج نہیں رہ گئی ہے کہ مسلمانوں کا کردار یونان اور جدید علوم کے درمیان ناقلِ محض اور واسطہ کا نہیں تھا اور تاریخ علوم میں انہوں نے صرف قدیم علمی میراث کی حفاظت اور اس کی آیندہ نسلوں تک منتقلی کا کردار نہیں ادا کیا اس کو ان بلندیوں تک پہنچایا جہاں وہ مستقبل کے علوم وفنون کی اساس بن سکیں۔واقعہ یہ ہے کہ ”علوم کی تاریخ میں عربی واسلامی علوم کا مقام اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آج تک کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے“۔(۴)

یوروپ کی اس اجتماعی احسان فراموشی کے برعکس مسلمانوں نے اپنے ان پیش رووں کے سلسلہ میں جن سے انہوں نے علوم اخذ کیے احسان مندی کے واضح اعتراف میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔اسی کے ساتھ ان کو اس علمی ورثہ میں جہاں کہیں کوئی بات خلاف واقعہ نظر آئی انہوں نے اس کی اصلاح ودرستی کا پورا اہتمام کیا۔اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے ذکر کے قابل ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ان اساتذہ کے تعلق سے ابتدا ہی سے مثبت نیز تواضع اور احترام کا رویہ اختیار کیا۔انہوں نے ان کی بہت سی رایوں اور نتائج تحقیق سے اختلاف بھی کیا لیکن احتیاط اور احترام کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔تنقید کے سلسلہ میں

ان کا اپنا ایک خاص انداز تھا جس کو پروفیسر سزکین نے تنقید کے اخلاقی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔(۵)

وہ یہ بات جانتے تھے کہ بڑے سے بڑا عالم بھی غلطی کرسکتا ہے اور اس سے اس کی علمی عظمت مجروح نہیں ہوتی۔ غلطی کی نشان دہی اور اس کی اصلاح ضروری ہے لیکن اس میں مبالغہ آمیزی اور اہانت کا پہلو نہیں نکلنا چاہیے۔ تنقید کے سلسلہ میں اس غیر معمولی احتیاط اور احترام کی پاس داری کی وجہ سے بہت سے محققین صحیح صورت حال کو سمجھنے سے قاصر رہے اور انہوں نے یہ گمراہ کن نتیجہ اخذ کرلیا کہ مسلمان علماء کے یہاں تنقیدی شعور کا فقدان تھا چنانچہ وہ قدماء کی تقلید محض سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ قدماء اور ان سے مستفید ہونے والے مسلمان علماء کے کام میں جو غیر معمولی تفاوت پایا جاتا ہے جس سے یہ محققین بھی ناواقف نہیں ہوسکتے تھے، وہ اس خیال کے بنیادی نقص کو ظاہر کرنے کے سلسلہ میں کافی ہے، اس سلسلہ میں البیرونی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت قول فیصل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ”میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان پر واجب ہے کہ اپنے فن میں کرے، یعنی اس فن میں جو لوگ اس سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان کے اجتہادات کو قبول کرے، اور اگر کچھ خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کردے اور جو کچھ اسے سوجھے، اسے اپنے بعد والے متاخرین کے لیے بطور یادداشت محفوظ کرجائے“۔(۶)

اس موضوع پر اتنی تفصیل کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس سلسلہ میں پائی جانے والی تمام خرابیوں اور برائیوں کی یہی جڑ اور بنیاد ہے۔ باقی اس شجرہ خبیثہ کی شاخیں ہیں۔ اسی سے مسلمانوں کی غیر معمولی اور عظیم الشان خدمات کے سلسلے میں اغماض، کتمان، انکار اور معاندانہ جذبات کی پیدائش اور آبیاری ہوئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے جس کھلی ہوئی ذہنی اور عقلی فضا میں متقدمین کے علم و دانش کو اخذ کیا تھا وہ اس سے یکسر مختلف تھا جس میں یوروپ کے باشندوں نے علوم کو مسلمانوں سے حاصل کیا۔ مسلمانوں نے ان علوم کو ان لوگوں سے حاصل کیا تھا جو مسلمان ہوچکے تھے۔ ان میں ان کے وہ ہم وطن بھی شامل تھے جو ان علوم سے بخوبی وقف تھے۔ چنانچہ ان سے ان علوم کے حاصل کرنے میں کوئی نفسیاتی پیچیدگی حائل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اہل مغرب کے سلسلہ میں صورت حال یکسر مختلف تھی۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ان علوم کو ان لوگوں سے حاصل کریں جو دینی اور سیاسی دونوں سطح پر ان کے حریف تھے اور اہل مغرب ان کے لیے شدید دشمنی اور بغض کے جذبات رکھتے تھے۔ یہ بغض اور نفرت اتنی

شدید تھی کہ ان سے علم و دانش کے خزانوں کو حاصل کرنے کے باوجود نہ تو اس میں کوئی کمی آئی اور نہ ان کے اندر اپنے ان محسنین کے لیے ممنونیت اور احسان مندی کے فطری جذبات بھی ابھرے۔ اس کے برعکس وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ عربی سے لاطینی میں ترجمہ کا کام چوتھی صدی ہجری کے نصف ثانی میں شروع ہو چکا تھا۔ اور بالآخر یہ عظیم الشان علمی سرمایہ جو مسلمانوں کی بے شمار نسلوں کی مسلسل کاوش اور عرق ریزی سے وجود میں آیا تھا مختلف ذرائع سے یوروپ منتقل ہو گیا۔ اہل یوروپ کے طرز عمل کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بنیادی اخلاقیات کا بھی مکمل فقدان تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اخلاقیات کا یہ بنیادی اصول بھی موجود نہیں تھا جس کی رو سے تصانیف کو ان کے اصل لکھنے والوں کی طرف منسوب کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت دیدہ دلیری سے مسلمانوں کی کتابوں اور تحقیقات کا سرقہ کیا اور ان کے تراجم کو اپنی طبع زاد کتابوں کی حیثیت سے پیش کیا (۷)۔ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرکے انہیں یونانی مشاہیر کے نام منسوب کر دیا (۸)۔ اس چوری اور خیانت کا ارتکاب کرنے والوں میں مغربی اسکالرشپ کے بڑے بڑے اساطین شامل ہیں۔ کتابوں، تحقیقات اور نظریات کی چوری کا یہ کاروبار صدیوں سے یوروپ میں پھلتا پھولتا رہا ہے اور اب جب کہ پروفیسر سزکین اور انصاف پسند مستشرقین کی تحقیقات سے حقیقی صورت حال کسی حد تک واضح ہو گئی ہے اور جہاں تہاں اسلامی علوم اور مسلمان علماء کو ان کا جائز حق دلانے کی بات بھی چل نکلی ہے، مغربی اسکالرشپ اب بھی بڑی حد تک اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ مغرب کے عام علمی حلقوں میں اب بھی یہ تصور پہلے ہی کی طرح عام ہے کہ گیارہویں صدی سے پہلے کا علمی سرمایہ تمام تر یونانی علوم تک محدود ہے اور اس کی بازگشت اسی تسلسل سے اسلامی دنیا میں بھی سنائی دیتی ہے۔ (باقی)

حاشیہ

(۱) تاریخ علوم تہذیب اسلامی کا مقام، خطبات ڈاکٹر فواد سزکین، ترجمہ ڈاکٹر خورشید رضوی، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، اشاعت دوم، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۔ (۲) خطبات، ص ۲۶۔ (۳) نفس مصدر، ص ۳۲۔ ۳۴۔ (۴) نفس مصدر، ص ۳۴، ۱۴۲۔ (۵) نفس مصدر، ص ۳۹، ۴۰۔ (۶) البیرونی، القانون: ۴۔ ۵، خطبات، ص ۴۱۔ (۷) خطبات، ص ۴۳۔ ۴۴، ۱۵۲۔ (۸) نفس مصدر، ص ۴۵۔

مطبوعات جدیدہ

جرنی آف فیتھ، مولانا عبدالماجد دریابادی: مرتبین: پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۸۰۰ روپے، پتہ: شپرا پبلی کیشنز، ال، جی ۱۹-۱۸، پنچ سنٹرل مارکیٹ، آئی پی ایکسٹنشن، پت پار گنج، دہلی ۱۱۰۰۹۲۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے کئی سفر نامے سپرد قلم کیے جن کی علمی، ادبی اور معلومات اہمیت مسلم ہے، لیکن خود ان کی زندگی کے سفر کا مطالعہ سب سے دلچسپ ہے، اسے تلاش حق کہیں یا سفر یقین و ایمان کہیں، یہ بہر حال سب سے زیادہ دلچسپ یوں ہے کہ یہ ظلمات سے نور کی اس ازلی داستان کا حصہ ہے جو روز اول سے انسان کے لیے مقدر کی گئی ہے، مولانا دریابادی کی شخصیت کی عظمت کسی بیان کی محتاج نہیں، بیسویں صدی کے جہان علم و ادب کے حکمرانوں کی مختصر ترین فہرست میں ان کا نام ناگزیر ہے، ان کی مجسم علم زندگی کا سب سے تابناک حصہ ان کی قرآنی خدمت ہے اور اردو اور انگریزی میں ان کی تفسیریں تو ان کے خاتمہ بالخیر کی بشارت ہیں، اس کتاب کے ایک مرتب پروفیسر اختر الواسع نے واضح کیا کہ یہی قرآنی پہلو، اس کتاب کا غالب حصہ ہے، خصوصاً انگریزی تفسیر تو تقابل ادیان کا خوبصورت ترین اور مفید ترین حصہ ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک سوانح دوسرا خدمات اور یہ دونوں حصے اس جامعیت سے ہیں کہ مولانا کی زندگی کا گویا ہر حصہ روشن ہوگیا ہے، خدمات میں انگریزی ترجمہ کے سلسلے میں درپیش مسائل، عصری تقاضوں کا خیال جیسے موضوعات پر مولانا کے خیالات ہیں اور ایک اہم مضمون حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ اور قرآن مجید پر بھی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک تحریر مولانا دریابادی بحیثیت قرآنی محقق کے عنوان سے اور پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا ایک مضمون بھی اسی نوعیت کا بھی آ گیا ہے۔ ان مضامین کی اہمیت نے انگریزی قارئین کے لیے افادیت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے، کتابیات کی طویل فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں فاضل مرتبین نے معلومات کے حصول میں کس درجہ جاں کاہی اور ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔ انگریزی زبان کے علوم اسلامیہ کے ذخیرہ میں یہ کتاب یقیناً قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

احوال مولائے کائنات: از: مولانا سید شاہ محمد بدرالدین نور عالم قادری پھلواروی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۶۴، قیمت: ۱۴۰ روپے، پتہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، بہار۔

خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علی بن ابی طالبؓ کے مبارک احوال پر کتابوں اور تحریروں کی کمی نہیں،

لیکن پیش نظر کتاب میں جس دلنشیں اور موثر ترین الفاظ میں حضرت علیؓ کے حالات بیان کیے گئے ہیں اس سے واقعی پڑھنے والوں کے دل میں محبت وعقیدت کی ایک دنیا آباد ہوجاتی ہے۔ حضرت شاہ بدرالدین پھلوارویؒ خانقاہ مجیبیہ کے گویا گل سرسبد تھے اور صحیح ہے کہ وہ بدرالکاملین تھے اور یہ بھی بالکل درست لکھا گیا کہ حضرت کے علمی فیوض اور برکت انفاس سے خانقاہ مجیبیہ کی نشاۃ ثانیہ اس طرح ہوئی کہ اس کی فیض رسانی عالم گیر ہوئی، ان ہی فیوض میں پیش نظر کتاب کے مضامین بھی ہیں جو اولاً خانقاہ کے رسالہ معارف میں شائع ہوئے، یہی معارف بعد میں ہمارے معارف کا نقش اول ثابت ہوا۔ ان مضامین میں پوری سیرت مرتضویؓ آ گئی ہے، فضائل اخلاق کا الگ باب ہے، کمال یہ ہے کہ اس میں عام مورخین کے برخلاف ایک سطر بھی ایسی نہیں جو خلافت علوی کے بعض واقعات میں عام قاری کے لیے تشویش کا سبب بن سکے، **من کنت مولاہ** کی روایت بھی ہے، چونکہ اس حدیث کی صحت واستناد پر عموماً اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے فاضل حاشیہ نگار نے مولی اور مولائے کائنات جیسے الفاظ کے استعمال کا جواز ثابت کرنے کے لیے عمدہ بحث کی، اس کے بعد اس متواتر ومشہور حدیث میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہتی، سنن ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، مستدرک حاکم، مصنف عبدالرزاق سے المعجم الاوسط والصغیر اور مجمع الزوائد کی ساری روایتیں مع ترجمہ پیش کردی گئیں، کتاب کی ایک اور بڑی خوبی حضرت علیؓ کے اقوال وفرمودات کا ابجدی طریقہ سے نقل کیا جانا ہے۔ **ایمان المرء یعرف بامانته** سے **یبلغ المرء بالصدق الی منازل الکبار** تک یہ اقوال کتاب کی افادیت میں چار چاند لگانے کی طرح ہیں، سخنہائے گفتنی میں جناب ہلال احمد قادری کی شیرینیٔ گفتار کا لطف ہے، بدر وہلال کا ایک ہی مطلع میں اجتماع یقیناً آیت اللہ ہونے کا اظہار ہے، موجودہ دور میں گرفتاران ابوبکرؓ وعلیؓ کی گرم گفتاری میں یہ کتاب برداً وسلاماً کے معانی سے آشنا کرتی جاتی ہے۔

ارشاد التسلیم الی علوم الحدیث النبی الکریمؐ: از: ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات: ۲۴۶، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ اور دیوبند کے مکتبے۔

اس کتاب کے مصنف کو علم حدیث سے خاص شغف ہے، اسی موضوع پر ان کی اور بھی کتابیں مثلاً ''تدوین حدیث عہد نبوی تا عہد بنی عباس'' اور ''روایت ودرایت حدیث ایک تجزیاتی مطالعہ'' شائع ہوچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں بھی مختلف ابواب میں تدوین حدیث کا مختلف ادوار میں جائزہ لیا گیا ہے، عہد صحابہ کے نوشتوں کے علاوہ تابعین کی کتاب حدیث اور اولین جامعین وکتب حدیث کا ذکر ہے، کتب حدیث کن انواع میں ہیں، ان کے طبقات، اسماء الرجال، جرح وتعدیل کا فن کیا ہے، اسباب تعدیل کیا ہیں، جرح وتعدیل کے

الفاظ کیا ہیں، تخریج حدیث اور سند و رواۃ کے نقد کا طریقہ کیا ہے، ان تمام سوالوں کا جواب آسان فہم انداز میں آ گیا ہے۔ یہ طلبائے حدیث کے لیے خاص طور پر کارآمد ہے، اس کے ساتھ درایت حدیث، علم مختلف الحدیث، علم ناسخ الحدیث، غریب الحدیث، فقہ الحدیث وغیرہ موضوعات بھی ہیں، اصلاً یہ مباحث مضامین کی شکل میں مختلف رسائل بشمول معارف شائع ہوئے تھے، اب کتابی صورت میں یہ اور نافع بن گئے۔

دیوان امداد امام اثر: ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سرور الہدی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۵۲، قیمت: ۳۰۰/روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۔۲۔

مزین مد بسم اللہ سے مطلع ہے دیواں کا الٰہی ہو اثر میرے بیاں میں حسن قرآں کا
فزوں ادراک سے ہے مرتبہ شاہ رسولاں کا اسے سرتاج خالق نے بنایا جن و انساں کا

جیسے اشعار سے اپنے دیوان کا آغاز کرنے والے نے اپنی حقیقت بھی بیاں کر دی کہ

فقیری میں مجھے بخشا خدا نے اوج سلطاں کا گدا مجھ کو بنایا آستان شاہِ مرداں کا

نازکی تو بات ہی ہے۔

بجا ہے گر اثر کی ذات پر نازش کرے دوراں فلک سے ہے زیادہ مرتبہ تیرے ثناخواں کا

یہ اثر سید امداد امام نام رکھتے تھے، ۱۸۸۹ء میں شمس العلماء ہوئے تھے۔ لیکن خلعت دوام تو ان کو کتاب کاشف الحقائق سے ملی، شاعر تھے اور ایسے کہ اردو کے ساتھ فارسی بھی ذریعہ اظہار خیال بنی اور اس شان سے کہ نقادوں یا مداحوں کو سعدی و حافظ کی یاد دلا گئی، کیسی نصیحت ہے۔

مبتلائے عشق باش و شاد باش وزغمِ ہر دو جہاں آزاد باش

ایسا شاعر اردو کے حافظہ سے محو ہو رہا تھا، فاضل مرتب جو گو تنقید و تحقیق کے نو واردوں میں ہیں لیکن ان کی خوش طالعی اردو تنقید و تحقیق کے لیے یقیناً فال نیک ہے، انہوں نے صرف دیوان کو پایا ہی نہیں سنوارا بھی اور سب سے بڑھ کر عالمانہ اور فاضلانہ مقدمہ لکھ کر دیوان کو آراستہ و پیراستہ کر دیا، قدامت و کلاسکیت کی وضاحت میں یہ جملہ اچھا لگا کہ انسانی جذبات و اقدار کو ثانوی درجہ دے کر صرف زبان و بیان کی بات کرنے والے، کلاسیکی شاعری کے اصل پارکھ نہیں ہو سکتے ..... جو لوگ نام نہاد لفظیاتی نظام اور ادبیت کی بات کرتے ہیں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ادب میں واردات و کیفیات کو رد کیے بغیر تنقیدی اختصاص قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا بھی مرتب کے غائر مطالعہ کا ثبوت ہے کہ اثر کی شاعری میں اگر کئی اسالیب در آئے ہیں تو وجہ یہ رہی کہ وہ جن شعراء کی زمین اختیار کرتے ہیں تو اسی رنگ میں غزل بھی کہنا چاہتے ہیں۔ کلام اثر کی اثر آفرینی کے ساتھ سرور کی نثر کے سرور نے کتاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

ارباب نظر: ڈاکٹر ایس اقبال قریشی، اقبال اکیڈمی، انڈیا، نئی دہلی۔

قیمت: ۳۰۰/روپے

تحقیق عمر عائشہؓ: انیس احمد، مہتاب بک ڈپو، ایک مینارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ۔

قیمت: ۸۰/روپے

جہات سرسید: ڈاکٹر شمس بدایونی، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰/روپے

شبلی خودنوشتوں میں: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

قیمت: ۴۰۰/روپے

قصیدے کی شعریات: مرتبین پروفیسر شہپر رسول و پروفیسر وہاج الدین علوی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ قیمت درج نہیں

کشف الاستار (اول تا چہارم): الحافظ نور الدین، تحقیق شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی، مراجعت ڈاکٹر مسعود احمد، مکتبہ المحدث الشیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی، مئو۔ قیمت درج نہیں

مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی و تاریخی بصیرت: ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی، شرفیہ قرأت اکیڈمی اینڈ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ قدیم ملک پیٹھ، حیدرآباد۔

قیمت: ۳۹۹/روپے

ہندوستانی میڈیا اور اردو: ڈاکٹر ذاکر حسین، سائنٹفک سوسائٹی پبلک لائبریری، دیوریا یوپی۔

قیمت: ۱۲۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
موازنہ انیس ودبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
December 2018 Vol - 202 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-